Registered No. L. 5340

جلد ۳۲   جمادی الاولیٰ ۱۳۶۹ھ

عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ :

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے	برائے پاکستان	قیمت فی پرچہ آٹھ آنے
" سات روپیہ نو آنے	برائے ہندوستان	" گیارہ آنے

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	۸/-	اسلام اور ضبط ولادت	۱/-
رسالہ دینیات	۱/۸	سود	۲/۸
حقوق الزوجین	۱/۸	اشتراکیت اور نظام اسلام	۳/۸
مسئلہ قومیت	۱/۸		
مسئلہ جبر و قدر	۱/-	نیا نظام تعلیم	-/۶/-
تجدید و احیائے دین	۱/-		
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-		
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۴	دین حق	-/۶/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۴	اسلام اور جاہلیت	-/۷/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸	ایک اہم استفتا	-/۳/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/۸	دستور جماعت اسلامی	/۳/-
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/-	روداد جماعت اسلامی حصہ اول	۱/-
پردہ	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۱۴/-
تنقیحات	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	۲/-
خطبات (نیا ایڈیشن)	۳/-	روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم	۲/-
تفہیمات	۳/۸	روداد اجتماع خواتین	-/۱۲/-
حقیقت توحید	۱/۲	جماعت اسلامی کی دعوت' بناؤ بگاڑ فی -/۹/-	
حقیقت تقویٰ	-/۱۲/-	حقیقت شرک	۲/-

عربی مطبوعات

اسلام کا نظریہ سیاسی	۱/-	انسان کا معاشی مسئلہ	۱/-
اسلامی حکومت	۱/-	اسلام اور جاہلیت	۱/-
دین حق	۱/-	شہادت حق	۱/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

۵۔ الف ذیلدار پارک' اچھرہ' لاہور (پاکستان)

ترجمان القرآن

فہرست مضامین

| جلد ۳۳ | ماہ جمادی الاوّل ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ اپریل سنہ ۱۹۵۰ء | عدد ۵ |

سید ابوالخیر مودودی نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

امسال حالات کے بعض اہم پہلوؤں کا لحاظ کرتے ہوئے جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے فیصلے کے مطابق کل پاکستان سالانہ اجتماع کے بجائے بہاولپور، کراچی، ملتان، گوجرانوالہ اور لائل پور میں حلقہ وار سالانہ اجتماعات منعقد کیے جا رہے ہیں۔ ان سطور کے قلمبند کرنے تک حلقہ بہاولپور، حلقہ سندھ، حلقہ ملتان اور حلقہ راولپنڈی کے اجتماعات بخیر و خوبی انجام پا چکے ہیں گوجرانوالہ اور لائل پور کے اجتماعات ابھی باقی ہیں۔ حلقہ لاہور کے اجتماع کے لئے ابھی تاریخوں کا اعلان نہیں ہوا۔

اب تک جو اجتماعات ہو چکے ہیں، یہاں مختصراً ان کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ان اجتماعات کے ساتھ جو جلسہ ہائے عام ہوئے ہیں، وہ حاضری کے اعتبار سے بہت ہی بڑے جلسے تھے۔ چنانچہ بہاولپور اور ملتان میں تو عام شہادت یہی تھی کہ اس معیار کے جلسے دونوں مقامات کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں، کراچی میں امیر جماعت کے افتتاحی خطاب کو سننے کیلئے اتنے لوگ آئے کہ خالق دینا ہال مع اپنے برآمدوں کے پوری طرح بھر گیا تھا۔ پھر جہانگیر پارک کے جلسوں میں تو حاضری بہت ہی زیادہ تھی۔ جلسہ گاہ کی روشنیوں کی شعاعیں جہاں تک پھیل سکتی تھیں، بندگانِ خدا صف بستہ بیٹھے نظر آتے تھے۔ ہمارے جلسوں کے حاضرین کی اکثریت ہر جگہ سنجیدہ و صالح لوگوں پر مشتمل تھی اور اس لحاظ سے یوں سمجھئے کہ سوسائٹی کا پورا مکھن جماعت اسلامی کی دعوت کو سننے کے لئے جمع ہو رہا ہے۔

ہمارے سامعین میں حکومت کے بڑے بڑے عہدے دار بھی تھے۔ عام ملازمین بھی تھے، ادیب شعرا اور صحافی بھی تھے، علمائے دین اور سیاسی کارکن بھی تھے، جج اور وکلا بھی تھے، مزدور اور کسان بھی تھے۔ بڑے بڑے تاجر اور خوانچہ فروش بھی تھے، اور عربی مدارس اور کالجوں کے طلبہ اور اساتذہ بھی تھے۔ سوسائٹی کا کوئی طبقہ ایسا نہیں تھا جس کا صالح عنصر جماعت اسلامی کی دعوت پر کھچ کر نہ آ گیا ہو۔

پھر یہ بات ہمارے لئے بہت ہی حوصلہ افزا ہے کہ ہمارے سامعین نے ہر جگہ انقلاب ذوق کی عملی شہادت پیش کی ہے۔ انہوں نے وقت کی پابندی کر کے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔ انہوں نے خشک تقاریر کو، جن میں صرف ٹھوس مواد تھا اور لطیفہ گوئی نہ تھی، پورے صبر و سکون سے سنا وہ تین تین چار چار گھنٹے کی نشستوں میں کسی انتشار کے بغیر جم کے بیٹھے رہے، انہوں نے جلسوں کی فضا کی سنجیدگی اور خموشی کو قائم رکھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور انہوں نے جماعت کے نظم کا پورا پورا احترام کیا۔ عوام کے اس طرزِ عمل نے ہماری ہمتوں میں بہت اضافہ کیا ہے۔

جماعت کی یہ ایک بہت ہی بڑی کامیابی ہے کہ اس نے اپنے اجتماعات کے ذریعے عوامی ذہن کی نئی تربیت کا جو کام شروع کیا تھا اس کے اثرات اب نمایاں طور پر محسوس کئے جا رہے ہیں جس قوم کو سالہا سال سے ہلڑ بازی کی تعلیم دی جاتی رہی ہے، آج وہی قوم نظم اور سنجیدگی کا مظاہرہ کر رہی ہے، اور وہ قوم جسے ایک عرصہ دراز سے دل خوش کن لفاظی کی چاٹ ڈالی گئی تھی اور جسے ہنگامہ پرور نعرہ بازی کا چسکا لگ چکا تھا، آج وہی ہے کہ ٹھوس تقاریر کو چار چار گھنٹے بیٹھ کے سنتی ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ ہماری تربیتِ عوام Nation Building کی چند سالہ کوششوں کا ایک نمایاں نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف ہمارے جلسوں میں اٹھک بیٹھک اور آمد و رفت کی وجہ سے کوئی انتشار نہیں ہوتا بلکہ شروع سے آخر تک ایک ایسی خاموشی جاری رہتی ہے جسے انگریزی زبان میں (PIN-DROP-SILENCE.) کہا جاتا ہے۔ علاوہ بریں ہماری دعوت پر آنے والے جلسہ گاہوں میں ناظمین اور صدر مجلس کی ہدایات کی پابندی جس ذوق و شوق سے

کرتے ہیں، ہمارے دلوں میں اس کی بھی خاص قدر ہے۔ خصوصیت سے کراچی کے حاضرین جلسہ نے تو اس معاملے میں ایک قابلِ یادگار مثال قائم کی ہے۔ جلسہ کے خاتمہ کا اعلان کرنے کے لیئے امیرِ جماعت آخری کلمات کہہ رہے تھے کہ لوگ اُٹھنے لگے۔ اس پر امیر جماعت نے حاضرینِ جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرات! جماعت اسلامی نے نظم کا جو معیار قائم کیا ہے، اُس کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک آپ کو جانے کے لیئے کہا نہ جائے، آپ اپنی جگہوں سے نہ ہلیں۔ براہِ کرم ایک منٹ کیلئے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ جایئے۔ چنانچہ جلسوں کی تاریخ میں یہ واقعہ بالکل انوکھا تھا کہ چلتے ہوئے لوگوں کے قدم اپنی اپنی جگہوں پر رُک گئے اور جو آدمی جہاں کھڑا تھا، وہیں بیٹھ گیا۔ اس حیرت انگیز واقعہ پر بعض اصحاب نے براہِ راست ہم سے مل کر تعجب کا اظہار کیا۔ درحقیقت یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جماعت اسلامی کی دعوت اب دلوں پر حکمراں ہو رہی ہے، اور یہ دعوت جب اللہ کے دین کی دعوت ہے تو اس کا حق بھی یہی ہے کہ دلوں پر حکمراں ہو۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک!

ان اجتماعات سے جماعت کے داخلی نظم کے بارے میں جو اندازہ ہو سکا ہے، وہ یہ ہے کہ بحمد اللہ ہمارے ارکان اور ہمدردوں میں جماعت کی پالیسی کے بارے میں کوئی انتشار موجود نہیں ہے، بلکہ نصب العین کے شعور کے ساتھ ساتھ طریقِ کار اور حکمتِ عملی پر کامل اتفاق کارفرما ہے۔

گذشتہ سال کے مقابلے میں کام کا دائرہ بہت وسیع ہو جانے کے سبب جماعت کے ہر رکن کے کندھے پر ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھ گیا ہے اور جب ان ذمہ داریوں کو پیشِ نظر رکھ کے ہم اپنے ارکان کی اخلاقی حالت اور ان کی سرگرمئ کار کا اندازہ کرتے ہیں تو ان کی گوناگوں کوتاہیوں کے باوجود ہم اُن کو اس قابل پاتے ہیں کہ اُن سے زیادہ وسیع امیدیں وابستہ کریں۔

کام کی وسعت جس رفتار سے بڑھ رہی ہے، اُسی کے مطابق ہمارے ارکان پر انفاقِ مال و وقت کی ذمہ داریاں بھی بڑھ رہی ہیں۔ بیشتر ارکان انفاقِ مال و وقت کا حق بساط بھر ادا کر رہے ہیں اور اگر اسی چیز کو تعلق باللہ کا معیار مانا جائے تو بہ حیثیت مجموعی جماعت نے اس معاملے میں بھی خاصی ترقی کی ہے، اگرچہ یہ پہلو ایسا ہے کہ موجودہ حالت کو پوری طرح قابلِ اطمینان نہیں کہا جا سکتا۔ تحریکِ اسلامی اُس سے زیادہ ایثار کی متقاضی ہے جتنا کہ اب تک ہم کر سکے ہیں۔

اجتماعات کا نظم قائم رکھنے اور اپنے آپ کو نظم کی حدود کا پابند بنائے رکھنے کے لحاظ سے بھی ہمارے رفقا پہلے سے زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔ اب بار بار اسکی ضرورت پیش نہیں آتی کہ پابندیٔ نظم کیلئے لاؤڈ اسپیکر سے ہدایات دی جائیں یا قدم قدم پر باہم ایک دوسرے کو ٹوکنا پڑے۔ ارکان تو ارکان ہیں، اب ہمارے ہمدرد اور متفق تک جن میں ان پڑھ دیہاتی بھی شامل ہوتے ہیں اجتماعات کے مختلف شعبوں کے متعلق یہ جانتے ہیں کہ نظم کے تقاضے کیا ہیں اور ان تقاضوں کو بدل و جان پورا کرتے ہیں۔

ان اجتماعات میں جماعت اسلامی کی طرف سے جو دعوت ہم اپنی قوم کو دینا چاہتے تھے بحمداللہ کہ وہ بہترین اسلوب سے پہنچا دی گئی ہے اور ہمارے رفقا اور عام سامعین اس کے گہرے اثرات لے کر اجتماعات سے رخصت ہوتے ہیں۔

ہماری مرکزی دعوت خدا کے دین کی طرف تھی۔ اس اصولی دعوت کو پیش کرتے ہوئے یہ حقیقت پوری طرح واضح کیگئی کہ خدا کی ہدایت ہی وہ ہدایت ہے اور نظامِ اسلامی ہی وہ نظامِ زندگی ہے جس کی پابندی کرنے میں ساری نوعِ انسانی اور خصوصاً ملّتِ پاکستان کی فلاح و بہبود مضمر ہے۔ اس اصولی دعوت کو پیش کرتے ہوئے پاکستان کے استحکام، اسکے دفاع اور اندرونی اور بیرونی خطرات سے

اس کے بجائے، ہندوستانی مسلمانوں کی مظلومیت، کشمیر پر انڈین یونین کے تسلط، حکومت اور عوام میں تعاون، صوبائی تعصبات، معاشی ناہمواریوں وغیرہ مسائل وقت کے بارے میں یہ واضح کیا گیا کہ ان سارے مسائل کا اصل حل خدا اور رسول کی اطاعت اور نظام اسلامی کا قیام ہے۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ ہم اس دعوت کے لئے جو سیدھا سادہ استدلال کرسکے ہیں، اُس کے ذریعے سُننے والے متاثر (CONVINCE) ہوئے ہیں۔

دین کی اصولی دعوت کے ساتھ ساتھ جماعت اسلامی کے مقصد اور طریق کار کی وضاحت کی گئی۔ مخالفینِ جماعت کی غلط فہمیوں کو صاف کرنے کیلئے عوام الناس کو یہ بتایا گیا کہ جماعت کا مقصد حکومت الٰہیہ یعنی نظام اسلامی کو عملاً قائم کردینے کے سوا کچھ نہیں، اور اس مقصد کے لیئے وہ اسلام کے بتلاتے ہوئے جمہوری اور بااخلاق طریقوں سے ایک پُرامن انقلاب پیدا کرنا چاہتی ہے۔

اسی ضمن میں یہ واضح کیا گیا کہ جماعت جب قوم کو دعوت دینے کے ساتھ ساتھ اپنے ارباب اقتدار کو مخاطب کرکے یہ کہتی ہے کہ:۔

ان الدین عند اللہ الاسلام	اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی دین برحق ہے۔

اور

اُدخلوا فی السّلم کافۃ	پورے کے پورے اسلام میں آؤ

اور

یا یھا الذین اٰمنوا لم تقولون مالا تفعلون	اے ایمان والو! وہ کچھ کہتے کیوں ہو جسے کرتے نہیں۔

تو ہمارے حکمران بھائی اس دعوت سے چڑتے ہیں اور تشدد پر اُتر آتے ہیں اسکی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ان کے کچھ مفاد ہیں اور ان کی کچھ عادات ہیں جن سے دست بردا

ہوئے بغیر اسلام کو عملاً اختیار کرنا ممکن نہیں، اور ان مفاد اور عادات کو چھوڑنے پر یہ حضرات تیار نہیں ہیں۔ یہ اصل بنائے نزاع ہے، جسے مختلف حیلوں اور بہانوں میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا ہے۔

تیسری بات جو ان اجتماعات کے ذریعے عوام الناس کے ذہن نشین کرائی گئی وہ یہ تھی کہ قرارداد مقاصد کو ہماری موجودہ قیادت نے عوام کے دباؤ سے مجبور ہو کر پاس تو کر دیا لیکن وہ اپنے بولے ہوئے بولوں پر ایک پورے سال میں نہ صرف یہ کہ کوئی مثبت عمل نہ کر سکی، بلکہ الٹا اس نے اپنے قول کو اپنے عمل سے پامال کرنے کی کوشش کی ہے۔ تبدیلی کے لئے تدریج ناگزیر ہے۔ لیکن کم سے کم سمت تو معین ہو چکی تھی اور اب جو قدم اٹھتا وہ قرارداد مقاصد کے تقاضوں کے مطابق صحیح سمت میں اٹھنا چاہیئے تھا لیکن بخلاف اسکے ہماری قیادت نظام زندگی کی گاڑیوں کو پوری تیز رفتاری سے قرارداد مقاصد کی مخالف سمت میں دوڑاتے چلی جا رہی ہے۔ جس تدریج سے کام ہو رہا ہے وہ بالکل الٹی تدریج ہے۔

اس سلسلے میں قرارداد مقاصد کے ایک ایک تقاضے کی وضاحت کرنے کے بعد ملک کے حکمرانوں کے عمل کا تفصیلی تجزیہ کر کے عوام کو مطلع کیا گیا کہ ہر تقاضے کی خلاف ورزیاں کرنے میں ہماری موجودہ قیادت کتنی سرگرم ہے۔ قرارداد مقاصد کو عمل میں لانے کے لیئے موجودہ قیادت کے نااہل ہونے کے بارے میں ایک جامع استغاثہ تھا جو ٹھوس دلائل کے ساتھ مرتب کر کے ملت کے سامنے رکھ دیا گیا۔ اس استغاثہ کو پیش کرتے ہوئے پوری دردمندی کے ساتھ قوم سے خطاب کیا گیا کہ اگر ہمارے حکمران بھائی قرارداد مقاصد پر خلوص سے عمل پیرا ہوتے تو ہم ان کی رکاب تھام کر چلنے میں فخر محسوس کرتے۔ لیکن یہ ہمارے لیئے ممکن نہیں ہے کہ وہ قرارداد مقاصد کی تخریب

(SABOTAGE) میں سرگرم عمل ہوں اور پاکستان کے عین مقصدِ وجود کے لئے خطرہ بن رہے ہوں تو بھی ہم ان کی قیادت پر ایمان و اعتماد کو بحال رکھیں۔ حالات ایسی جگہ آ پہنچے ہیں کہ ہمارے سامنے "اسلام یا موجودہ قیادت" کا دوٹوک سوال پیدا ہو گیا ہے۔ اب ہم پاکستان کی فلاح اور بہبود اور اسلام کی بقا کے لئے اسبات پر مجبور ہیں کہ انتخابات منعقد کرانے کے لئے زور دیں اور انتخابات کے ذریعے انقلابِ قیادت بپا کر دکھائیں۔

چوتھی بات جو عوام کے سامنے رکھی گئی وہ یہ تھی کہ صالح قیادت ہمیشہ صالح سوسائٹی میں سے نمودار ہوا کرتی ہے۔ اور صالح سوسائٹی کے بل پر ہی وہ قائم رہ سکتی ہے۔ لہٰذا ہمارے عوام کو اپنی اصلاح پر متوجہ ہونا چاہیئے۔ اس سلسلے میں اسبات پر بھی زور دیا گیا کہ جو لوگ اسلام کو برسرِ اقتدار دیکھنا چاہتے ہیں وہ اپنے آپ کو جماعت اسلامی کے ساتھ ارکان، ہمدردوں یا متفقین کی صفوں میں منظم کریں۔

(پانچویں دعوت جو دی گئی وہ آئندہ انتخابات میں ووٹ کی مقدس امانت کو صحیح طریق سے استعمال کرنے کی دعوت تھی۔ اس دعوت کو پیش کرتے ہوئے صالح قیادت کے اوصاف اور اس کے لئے اسلامی معیار کو پورے دلائل کے ساتھ واضح کیا گیا علاوہ بریں عوام کو انتخابات کے اسلامی اصولوں سے آگاہ کیا گیا۔ اور انہیں ان اصولوں کی پابندی کی تلقین کی گئی۔)

چھٹی حقیقت جو واضح کی گئی وہ جماعت اسلامی کے تین قابلِ احترام افراد کی نظر بندی کے متعلق تھی۔ ہر اجتماع میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی اور میاں طفیل محمد صاحب کے بارے میں پبلک کو پوری طرح آگاہ کر دیا گیا کہ یہ حضرات اسلامی نظام کی علمبرداری کے سوا کسی اور جرم کے مجرم نہ تھے، اور ان کے خلاف سیفٹی ایکٹ جیسا ناپاک حربہ استعمال کرتے ہوئے ہمارے حکمرانوں نے جس غیر دیانت دارانہ پروپیگنڈے کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے وہ جھوٹ اور افترا کے ایک طوفان کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اسکے ساتھ ساتھ ہر اجتماع میں جماعت نے حکومت کو کھلے الفاظ میں چیلنج کیا کہ ہمارے نظر بند رفقا کے خلاف اگر حکومت اپنے عائد کردہ الزامات کیلئے کوئی دلائل رکھتی ہے تو وہ اپنے دلائل کو کسی عدالت میں، دیانتدار علما کی کسی مجلس خاص

میں پریس میں یا کسی عام جلسہ میں پیش کرے اور دوسری طرف وہ جماعت اسلامی کے محترم نظر بندوں کو جواب میں صفائی پیش کرنے کا مساویانہ موقعہ دے ــــــــــــ اور اگر ان میں سے کوئی صورت قابل قبول نہ ہو تو پھر دیانتداری کی راہ صرف ایک ہے : یہ کہ حکومت اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور ہمارے محترم رفقاء کو رہا کر دے۔

ساتویں چیز عوام کے سامنے یہ رکھی گئی کہ آپ کو حکومت کے سابق پروپیگنڈے کا تجربہ ہو چکا ہے کہ کس طرح ساحرانہ ہتھکنڈوں سے آپ کے ذہنوں کو جماعت کے متعلق مسموم کرنے کی کوششیں کی گئی تھیں، لیکن آہستہ آہستہ اصل حقیقت آشکارا ہو کے رہی، پس اب اس تجربہ کے پیش نظر آپ آئندہ کیلئے خبردار رہیں اور اگر جماعت کے خلاف پروپیگنڈے کی کوئی نئی لہر اٹھائی جائے جس کے آثار نمودار ہو رہے ہیں تو آپ آسانی سے "حکمران کی ساحری" کا شکار نہ ہوں۔ خصوصیت سے آجکل حکمران طبقہ پروپیگنڈے کا نیا طوفان اٹھانے کے لئے یہ شوشہ چھوڑنے پر اُتر آیا ہے کہ جماعت اسلامی انڈونیشیا کی دارالاسلام پارٹی سے مماثلت رکھتی ہے اور مسلح انقلاب چاہتی ہے۔ لیکن آپ آگاہ رہیں کہ جماعت قول و فعل کے دوگونہ لحاظ سے اس قسم کے گھناؤنے الزامات سے پوری طرح بری ہے۔

یہ تھے اس دعوت کے مختلف اجزاء جنہیں ملت تک پہنچانے کے لئے حلقہ وار اجتماعات منعقد ہو رہے ہیں اور الحمدللہ کہ یہ دعوت عوام کے دماغوں کو ہی نہیں، دلوں کو بھی برابر متاثر کر رہی ہے۔

اِن اجتماعات تک جماعت کے کارکنوں نے جو کام کیا ہے اور خود ان اجتماعات میں جو کام ہوا ہے، اس سے عوام کے اندر کس طرح کے اثرات نمودار ہو رہے ہیں۔ ان کا جو سرسری اندازہ کیا جا سکا ہے، اس کے بارے میں چند جملے سپرد قلم کئے جا رہے ہیں۔ حسب ذیل تاثرات کو خاص طور پر محسوس کیا گیا۔

(۱) جماعت کے خلاف حکومت کا پروپیگنڈہ پوری طرح شکست کھا چکا ہے اور اب جماعت کی مخالفت کرنے والے عناصر دم توڑ چکے ہیں۔ ان اجتماعات میں مخالفانہ سوالات اعتراضات اور غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی کوئی مثال سامنے نہیں آئی۔ بلکہ اب جماعت کے لئے ایک ہمہ گیر جذبۂ ہمدردی کارفرما ہے اور ہر طرف جماعت کے لئے خیر مقدم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مدظلہ کے دورۂ ۱۹۴۸ء کے موقع پر عوام جس طرح جماعت کی طرف سے ذوق و شوق سے یکایک مائل ہوئے تھے، قریب قریب وہی حالت دوبارہ لوٹ آئی ہے۔ بیچ کے وقفے میں ہمارے ارباب اقتدار کے پروپیگنڈے کا جو اثر پڑا تھا وہ بالکل کالعدم ہو چکا ہے۔

جماعت کی طرف عوام کی رغبت نے اس بات کی پوری شہادت بہم پہنچا دی ہے۔ کہ اب سرکاری افسروں کے پروپیگنڈے کے لئے اگر کوئی میدان کار رہ گیا ہے تو وہ ان کے اپنے دفاتر ہیں، جہاں وہ جو کچھ چاہیں کہتے رہیں اور جس طرح کے سرکلر چاہیں، جاری کرتے رہیں۔

(۲) یہ محسوس کیا گیا ہے کہ پبلک میں جماعت کے حق میں ایک جذبۂ اعتراف موج زن ہے۔ لوگ سمجھ چکے ہیں کہ جماعت ملک کے پورے نظم و نسق میں کیا تبدیلیاں چاہتی ہے اور وہ مختلف مسائلِ حیات کو اسلامی اصولوں کے ذریعے کس نہج سے حل کرنے کا پروگرام پیش نظر رکھتی ہے۔ چنانچہ اسلامی نظام کے قیام کے بارے میں اب جماعت اسلامی ہی فطری طور پر پبلک کی ساری توقعات کا محور بنتی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عوام النّاس کے دلوں میں یہ اثر بھی پیدا ہو چکا ہے کہ اس جماعت کی تنقید ہمہ تن تعمیری اور مخلصانہ ہوتی ہے اور اسی وجہ سے کلمۂ حق کے بلند کرتے میں اس کے کارکنوں کو ذرہ بھر باک نہیں ہوتا۔

(۳) ہمارے ذہین طبقے میں خصوصیت سے جماعت کا رسوخ بڑھ رہا ہے۔ اب وہ بات نہیں رہی کہ جماعت اسلامی کے کارکنوں کو ملّا اور مولوی کہہ کر ٹال دیا جاتا ہو، بلکہ گذشتہ ایک

سال کی جدّ وجہد کے بعد جماعت کے بارے میں ذہین عناصر یہ بات محسوس کر چکے ہیں کہ یہ جماعت جس طرح اسلام کو کتاب وسنّت سے سمجھتی ہے، اسی طرح مسائل حاضرہ کو بھی جانتی ہے اور ان کا تجزیہ کر کے اُن کے لئے اسلامی حل بتا سکتی ہے۔ پھر ہمارے اجتماعات کے نظم اور ہماری تحریک کے منظم طریق کار نے بھی ملک کے ذہین عناصر کو مطمئن کر دیا ہے کہ یہ جذباتی ہنگامہ آرائی کرنے والے لوگ نہیں ہیں، بلکہ مسائل سیاست و معیشت کا پورا شعور رکھتے ہوئے اسلامی نظام کے قیام کی دعوت دیتے ہیں۔

دوسری طرف مخلص علمائے دین بھی اب جماعت کو جزئی اور فروعی مسائل کی کسوٹی پر پرکھنے کے مقام سے بلند تر ہو کر اس کے عظیم الشان نصب العین کے لحاظ سے اس کی سرگرمیوں کا عالی ظرفی کے ساتھ جائزہ لے رہے ہیں۔ ان میں ایک بڑی تعداد ایسی ہے جس کی ہمدردیاں جماعت کے ساتھ ہیں اور بہت سے علماء ایسے بھی ہیں جو جماعت سے باہر رہنے کے باوجود نظام اسلامی کے قیام کی جدّ وجہد میں عملاً اس کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔

رہا ہمارے عام لوگوں کا نقطۂ نظر، سو اس معاملے میں بھی حالات کا ارتقاء بے حد حوصلہ افزا ہے۔ مزدوروں اور کسانوں اور دوسرے غریب طبقوں کی طرف سے اب پاکستان کے مختلف حصّوں سے جماعت سے رہنمائی کا مطالبہ کیا جانے لگا ہے، اور جماعت اپنی بساط بھر اس مطالبے کے جواب میں اپنی خدمات پیش کر رہی ہے۔

(۴) موجودہ قیادت کے کارناموں پر جماعت اسلامی کے مخصوص سنجیدہ و متوازن اسلوب کے ساتھ جو تعمیری تنقید ان اجتماعات میں کی گئی ہے، اس کے بارے میں عوام کے احساسات ہر جگہ یہ تھے کہ ان کے چہرے پکار پکار کر کہہ رہے تھے۔

"میں نے جانا کہ یہ بھی گویا میرے دل میں ہے۔"

جو بات جماعت اسلامی کے اسٹیج سے کہی گئی، اس کے بارے میں سننے والوں نے یہی سمجھا

کہ ٹھیک ان کے دلوں کی ترجمانی ہے جو کی جارہی ہے۔

اور پھر، انقلاب قیادت کی دعوت پر پورے شرح صدر کے ساتھ عوام داعیان جماعت اسلامی کے ہمنوا تھے۔ کسی حلقے کے عوام کو ہم نے موجودہ ارباب اقتدار کا پرستار اور ان کی غلط کاریوں میں ان کا ہم نوا نہیں پایا، بلکہ یہ حقیقت ہر جگہ صاف صاف عیاں تھی کہ لوگ ایک قیادت صالحہ کی پیاس دلوں میں لئے ہوئے تھے اور جماعت اسلامی کے اجتماعات میں شریک ہونے کے بعد ان کی یہ پیاس اور زیادہ بڑھ چکی ہے۔

(د) جہاں تک نظر بند رفقاء کا تعلق ہے، اب عوام کو ان کے بارے میں کسی طرح کی غلط فہمی نہیں رہی۔ وہ حقیقتِ حال کو جان چکے ہیں، اور ہمیں کوئی فرد دورانِ سفر یا اجتماعات میں ایسا نہیں ملا جس نے ہمارے محترم نظر بند رفقاء کی نظر بندیوں کے جائز ہونے یا ان کے خلاف حکومت کے الزامات کے برحق ہونے کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا ہو، بلکہ الٹا ہر ایک نے حکومت کی روش کو غلط قرار دیا اور بعض موقعوں پر حکومت کے طرزِ عمل کے مجرمانہ ہونے کے لئے سخت قسم کے الفاظ سننے میں آئے۔ جنہیں خود ہماری زبانیں کبھی نہیں کہہ سکتیں۔

اس معاملے میں عوامی جذبات و احساسات ایک ایسی حد کو پہنچ چکے ہیں کہ اگر جماعت اسلامی کی جگہ کوئی دوسری جماعت ہوتی جس نے اپنے آپ کو اسلامی حُدودِ اخلاق سے بے نیاز رکھا ہوتا، تو وہ پورے ملک میں ایک ہڑ مچا کے دکھا سکتی تھی۔ لیکن ہم اس بات کو جاننے کے باوجود کہ ہمارے حکمران اسلامی اخلاق کے قدردان نہیں ہیں اور وہ صرف ہلڑ بازی ہی سے اثر لینے کے عادی ہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو بہرحال اسلام کے معیار پر قائم رکھنے کی کوشش کی ہے اور انتہائی مظلومیت کے موقف پر ہونے کے باوجود اپنے حکمرانوں پر ان کی غلطی واضح کرنے کے لئے صرف اتنے ہی پر اکتفا کیا ہے کہ رائے عامہ کو حکومت کے طرزِ عمل کے خلاف بیزاری اور جماعت کے حق میں ہمدردی کے موقف پر قائم کر دیا ہے۔

ایک شریف اور دیانتدار حکومت کے لئے رائے عامہ کا اس طرح یک سو ہو جانا اس بات کے لئے کافی ہوتا ہے کہ وہ اس کے مطابق اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لے۔ اور اپنی ناجائز کارروائیوں کو جو پبلک کی نگاہ میں قدر کھو چکی ہوں، ترک کر دے۔ لیکن اگر شرافت و دیانت کے تقاضاؤں کو کوئی حکومت نظر انداز کر کے ایک غلط مسلک کو جاری رکھنے کے لئے "راج ہٹ" پر اتر آئے تو اس کو سیدھے راستے پر ڈالنے کے لئے غیر اسلامی تحریکوں کے پاس تو جائز و ناجائز مختلف قسم کے طریقے ہائے کار ہوتے ہیں لیکن اسلامی تحریک سنجیدگی اور صبر کے تقاضاؤں سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم صبر اور سنجیدگی ہی کے ذریعے بازی جیت سکیں۔

بہر حال ان تازہ اجتماعات سے کارکنانِ حکومت کو یہ اندازہ کر لینا چاہیئے کہ رائے عامہ اب کس کے ساتھ ہے: —— مولانا مودودی اور ان کے رفقاء کو نظر بند کرنے والوں کے ساتھ ہے یا وہ اُن نظر بندوں کے ساتھ ہے؟

اس دوران میں ایک افسوسناک چیز سامنے آئی۔ یہ کوئی بالکل نیا انکشاف تو نہیں ہے لیکن بہر حال اس معاملے میں تازہ معلومات بہم پہنچی ہیں کہ پریس جماعت اسلامی کی خبروں کا بلیک آؤٹ کر رہا ہے۔

پریس شائد زیادہ قصوروار نہیں، بلکہ اسے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ جماعت اسلامی کے وجود کا کوئی ثبوت پریس میں نہ آنے دے۔ یہ اسکیم اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ اس طرح تحریک اسلامی کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

آپ غور کیجئے کہ بہاولپور، ملتان، کراچی اور راولپنڈی میں بہت بڑے بڑے اجتماعات منعقد ہوتے ہیں۔ یہ اجتماعات ایک ایسی منظم جماعت کے ہیں جس کا وجود اور جس کی سرگرمیاں پاکستان کی سیاسی فضا کا ایک اہم حصہ ہیں جس کے بعض کارکن پنجاب

ہیں اور بعض سرحد و میں قید و بند میں مبتلا ہیں، جو موجودہ قیادت کو بدلنے کیلئے ایک ناقابلِ فراموش جدّ وجہد کر رہی ہے اور جس نے آئندہ انتخابات میں حصّہ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ اس جماعت کے اجتماعات اور ان اجتماعات کی کارروائیوں میں کوئی خبری قدر (NEWS VALUE) پریس کو نہیں ملتی۔ یقیناً جماعت کی خبروں کی ایک سیاسی اہمیت ہے لیکن پریس کو جب ایک مقتدر طاقت سیفٹی ایکٹ اور سیفٹی آرڈی ننس کے اسلحہ سے مسلح ہو کر اس معاملے میں تلقین کرتی رہتی ہو کہ خبردار اس جماعت کا پروپیگنڈہ نہ کرنا۔ تو آخر ہمارے پریس کے کارکن کریں تو کیا کریں۔ ان میں سے بھلے لوگ اس صورتِ حالات کے باوجود آنکھ بچا کے دو چار سطروں کی خبر ادھر اُدھر کسی نہ کسی کونے میں درج کر ہی دیتے ہیں اور ہم ان کی جرأت کی قدر کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ کرنا ان کے بس میں نہیں ہے، تا وقتیکہ ہمارے ملک میں شہری آزادیاں پوری طرح بحال نہ ہو جائیں۔

یہ کتنے عجیب حالات ہیں کہ کراچی میں بہت بڑے پیمانے کے جلسے ہوتے ہیں لیکن صرف ڈان میں ایک چار سطری خبر آجاتی ہے اور ملک کے باقی پریس کے لئے گویا کوئی واقعہ ہوتا ہی نہیں۔ ملتان میں بہت بڑی حاضری کے ساتھ جلسۂ عام ہوتا ہے اور ایک آدھ اخبار میں سرسری سی خبر درج ہو کے رہ جاتی ہے اور تین چار تقاریر میں سے صرف ایک جملہ چھانٹ کر درج کر دیا جاتا ہے جس سے پڑھنے والوں کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ نیوز رپورٹرز نے بذریعہ تار جو رپورٹیں ہمارے اجتماعات کی پریس کو روانہ کی ہیں، بعض مقامات پر ان کی نقول ہم کو دکھائی گئی ہیں، لیکن خود ان رپورٹرز نے تعجب کا اظہار کیا ہے کہ جماعت اسلامی کی جو خبریں ہم بھیجتے ہیں وہ شائع نہیں ہوتیں۔

خود حکومت کے ریڈیو کو لیجئے، جماعت کی ان ساری سرگرمیوں کے بارے میں کبھی ایک حرف تک ریڈیو سے بطور خبر کے نشر نہیں ہوتا، جیسے جماعت اسلامی نام کی کوئی جماعت

ملک میں موجود نہیں ہے اور وہ کوئی ایسا کام نہیں کر رہی جس کی خبر بیان کی جا سکتی ہو۔ یہ دراصل "شترمرغ" کی پالیسی ہے کہ اپنی آنکھیں بند کر لو اور پھر یہ سمجھ لو کہ کوئی موجود ہے ہی نہیں۔

یہ ایک موجود اور بڑھتی اور پھیلتی ہوئی شے کے وجود کو نظر انداز کرنے کی کوشش، دیکھئے کہاں تک جاری رہتی ہے؟

ان اجتماعات کے ذریعے رفقائے جماعت کو جو پروگرام سپرد کیا گیا ہے اس کے اہم پہلو یہ ہیں:—

(۱) تہذیب بالغاں کے کام پر زیادہ توجہ دی جائے، کیونکہ عوام کی تربیت، تنظیم، اصلاحِ اخلاق اور اُنکے سیاسی شعور و فہم کے لئے یہی بہترین ذریعہ ہے۔

(۲) آئندہ انتخابات کے لئے عوام کو اسلام کی صحیح رہنمائی بہم پہنچائی جائے اور صالح افراد کے انتخاب کے لئے انہیں ایک عزمِ صمیم پر قائم کر دینے کے لئے زیادہ سے زیادہ جد و جہد کی جائے۔

(۳) جماعت کے حلقۂ ہمدردان اور حلقۂ متفقین کی توسیع کا کام زیادہ سے زیادہ محنت سے کیا جائے۔

(۴) مزدوروں اور کارخانہ داروں، کسانوں اور زمینداروں کو طبقاتی کش مکش سے ہٹا کر اسلامی عدل کے اصولوں پر قائم کرنے کے لئے منظم طریق سے دعوت دی جائے اور جہاں حالات سازگار ہوں، ان کی تنظیمیں قائم کر دی جائیں۔ ملازمین حکومت کو بھی حقوق طلبی کے لئے کمیونسٹ زاویہ نگاہ سے ہٹ کر اسلامی اصولوں پر منظم ہونے کی دعوت دی جائے۔

ہم جہاں تک اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے ہیں، اس کے لئے اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ اسی کی عنایات کے طفیل ہوا ہے۔ اور اب جو عزائم لے کے

ہم تحریک کے سال آئندہ کا پروگرام عمل میں لانے کے لئے اٹھے ہیں۔ خدا ان عزائم میں ہمیں ثابت قدمی عطا فرمائے، وہ ہمیں جوشِ عمل سے نوازے، اور وہی خود قدم قدم پر ہماری رہنمائی فرمائے! آمین۔

آخر وہی ہوا جو نہ ہونا چاہیئے تھا!

ہمارے حکمرانوں نے قراردادِ مقاصد کے سارے اصولوں کو پامال کرتے ہوئے اور رائے عام اور پریس کے مطالبے کو کچلتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مولانا امین احسن اصلاحی اور میاں طفیل محمد صاحب کی نظربندی میں مزید چھ ماہ کا اضافہ کردیا ہے۔ اس آخری اضافے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ہمارے حکمران اپنے جذبۂ اقتدار پسندی کے تحت ان حضرات کے خلاف ایک انتقامی کارروائی جاری رکھے ہوئے ہیں، جس کے جواز کی کوئی دلیل اُن کے پاس باقی نہیں ہے۔

ملک کی ساری جماعتوں اور دینی انجمنوں اور تمام شہریوں کو اب حکومت کے اس ظالمانہ فیصلے کے خلاف نفرت اور حقارت کو پورا پورا اظہار کرنا چاہیئے

(ناظم شعبہ نشرواشاعت جماعت اسلامی پاکستان)

مقالات

سود میں نئے مباحث کا اضافہ

(قسط ۵)

(از مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی)

حرمتِ سود (ایجابی پہلو)

یہاں تک جو کچھ بحث ہم نے کی ہے اس سے تو صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ سود نہ تو کوئی معقول چیز ہے، نہ وہ انصاف کا تقاضا ہے، نہ وہ کوئی معاشی ضرورت ہے، اور نہ اس میں فی الحقیقت فائدے کا کوئی پہلو ہے۔ لیکن سود کی حرمت صرف ان منفی اسباب ہی پر مبنی نہیں ہے، بلکہ اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ قطعی طور پر ایک نقصان دہ چیز ہے، اور بہت سے پہلوؤں سے بہت زیادہ نقصان دہ ہے۔

اس باب میں ہم ایک ایک کر کے ان نقصانات کا تفصیلی جائزہ لیں گے تاکہ کسی معقول آدمی کو اس ناپاک چیز کی حرمت میں ذرہ برابر بھی شبہ باقی نہ رہ جائے۔

سود کے اخلاقی و روحانی نقصانات سب سے پہلے اخلاق و روحانیت کے نقطۂ نظر سے دیکھئے کیونکہ اخلاق اور روح ہی اصل جوہر انسانیت ہے اور اگر کوئی چیز ہمارے اس جوہر کو نقصان پہنچانے والی ہو تو بہر حال وہ قابلِ ترک ہے خواہ کسی دوسرے پہلو سے اس میں کتنے ہی فوائد ہوں۔ اب اگر آپ سود کا نفسیاتی تجزیہ کریں گے تو آپ کو بیک نظر معلوم ہو جائے گا کہ روپیہ جمع کرنے کی خواہش سے لے کر سودی کاروبار کے مختلف مرحلوں تک پورا ذہنی عمل خود غرضی، بخل، تنگ دلی، سنگدلی اور زر پرستی جیسی صفات کے زیر اثر شروع ہوتا ہے، انہی صفات کے زیر اثر جاری رہتا ہے، اور جتنا جتنا آدمی اس کاروبار میں آگے بڑھتا جاتا ہے، یہی صفات اس کے اندر نشوونما پاتی چلی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس زکوٰۃ، صدقات کی ابتدائی نیت سے لے کر اس کے عملی ظہور تک پورا ذہنی عمل فیاضی، ایثار، ہمدردی، فراخ دلی، عالی ظرفی اور خیر اندیشی جیسی صفات کے زیر اثر واقع ہوتا ہے اور اس طریق کار پر مسلسل عمل کرتے رہنے سے یہی صفات انسان کے اندر نشوونما

باقی ہیں۔ کیا کوئی انسان دنیا میں ایسا ہے جس کا دل یہ شہادت نہ دیتا ہو کہ اخلاقی صفات کے ان دونوں مجموعوں میں سے پہلا مجموعہ بدترین اور دوسرا مجموعہ بہترین ہے؟

تمدنی و اجتماعی نقصانات اب تمدنی حیثیت سے دیکھئے۔ ایک ذرا سے غور و خوض سے یہ بات ہر شخص کی سمجھ میں بآسانی آسکتی ہے کہ جس معاشرے میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ خود غرضی کا معاملہ کریں، کوئی اپنی ذاتی غرض اور اپنے ذاتی فائدے کے بغیر کسی کے کام نہ آئے، ایک کی حاجت مندی دوسرے کے لئے نفع اندوزی کا موقع بن جائے اور مالدار طبقوں کا مفاد نادار طبقوں کے مفاد کی ضد ہو جائے، ایسا معاشرہ کبھی مستحکم نہیں ہو سکتا۔ اس کے اجزاء ہمیشہ انتشار و پراگندگی ہی کی طرف مائل رہیں گے۔ اور اگر دوسرے اسباب بھی اس صورتِ حال کے لئے مددگار بن جائیں تو ایسے معاشر کے اجزاء کا باہم متصادم ہو جانا بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس کے برعکس جس معاشرے کا اجتماعی نظام آپس کی ہمدردی پر مبنی ہو جس کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کریں، جس میں ہر شخص دوسرے کی احتیاج کے موقع پر فراخ دلی کے ساتھ مدد کا ہاتھ بڑھائے، اور جس میں مالدار لوگ نادار لوگوں کے ساتھ ہمدردانہ اعانت، یا کم از کم منصفانہ تعاون کا طریقہ برتیں، ایسے معاشرے میں آپس کی محبت اور خیر خواہی اور دلچسپی نشوونما پائیگی۔ اس کے اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ اور ایک دوسرے کے پشتیبان ہوں گے۔ اس میں اندرونی نزاع و تصادم کو راہ پانے کا موقع نہ مل سکیگا۔ اس میں باہمی تعاون اور خیر خواہی کی وجہ سے ترقی کی رفتار پہلے معاشرے کی بہ نسبت بہت زیادہ تیز ہوگی۔

ایسا ہی حال بین الاقوامی تعلقات کا بھی ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ فیاضی و ہمدردی کا معاملہ کرے اور اسکی مصیبت کے وقت کھلے دل سے مدد کا ہاتھ بڑھائے، ممکن نہیں ہے کہ دوسری طرف سے اس کا جواب محبت اور شکر گذاری اور مخلصانہ خیر خواہی کے سوا کسی اور صورت میں برآمد ہو۔ اس کے برعکس وہی قوم اگر اپنی ہمسایہ قوم کے ساتھ خود غرضی و تنگ دلی کا برتاؤ کرے اور اسکی مشکلات کا ناجائز فائدہ اٹھائے تو ہو سکتا ہے کہ مال کی صورت میں وہ بہت کچھ نفع اس سے حاصل کرے، لیکن یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ پھر اپنے اس شائیلاک قسم کے ہمسایہ کے لئے اس قوم کے دل میں کوئی اخلاص اور محبت اور خیر خواہی باقی رہ جائے۔ ابھی کچھ زیادہ مدت نہیں گزری، پچھلی جنگ عظیم کے زمانہ کی بات ہے کہ انگلستان نے امریکہ سے ایک بھاری قرض کا معاملہ طے کیا جو [illegible] کے نام سے مشہور ہے۔ انگلستان چاہتا تھا کہ امریکہ اس کا خوشحال دوست جو اس لڑائی میں اس کا رفیق بھی تھا، اسے بلا سود قرض

دے دے۔ لیکن امریکہ سود چھوڑنے پر راضی نہ ہوا اور انگلستان اپنی مشکلات کی وجہ سے مجبور ہو گیا کہ سود دینا قبول کرے۔

اِس کا جو اثر انگریزی قوم پر مترتب ہوا وہ اُن تقریروں اور تحریروں سے معلوم ہو سکتا ہے جو اس زمانے میں انگلستان کے مدبرین اور اخبار نویسوں کی زبان اور قلم سے نکلیں۔ مشہور ماہر معاشیات لارڈ کینز آنجہانی، جنہوں نے انگلستان کی طرف سے یہ معاملہ طے کیا تھا، جب اپنے مشن کو پورا کر کے پلٹے تو انہوں نے برطانوی دارالامراء میں اس پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں تمام عمر اس رنج کو نہ بھولوں گا جو مجھے اس بات سے ہوا کہ امریکہ نے ہم کو بلاسود قرض دینا گوارا نہ کیا۔ مسٹر چرچل جیسے زبردست امریکہ پسند شخص نے کہا کہ یہ بنیے پن کا برتاؤ جو ہمارے ساتھ ہوا ہے مجھے اس کی گہرائی میں بڑے خطرات نظر آتے ہیں۔ ”سچی بات یہ ہے کہ اس کا ہمارے باہمی تعلقات پر بہت ہی برا اثر پڑا ہے“۔ اُس وقت کے وزیر خزانہ ڈاکٹر ڈالٹن نے پارلیمنٹ میں اس معاملے کو منظوری کے لئے پیش کرتے ہوئے کہا کہ ”یہ بھاری بوجھ جسے لادے ہوئے ہم جنگ سے نکل رہے ہیں ہماری اُن قربانیوں اور جفاکشیوں کا بڑا ہی عجیب صلہ ہے جو ہم نے مشترک مقصد کے لئے برداشت کیں۔ اِس نرالے ستم ظریفانہ انعام پر آئندہ زمانے کے مورخین ہی کچھ بہتر رائے زنی کر سکیں گے ..... ہم نے درخواست کی تھی کہ ہم کو قرضِ حسن دیا جائے مگر جواب میں ہم سے کہا گیا کہ یہ عملی سیاست نہیں ہے“۔

یہ سود کا فطری اثر اور اُس کا لازمی نفسیاتی ردعمل ہے جو ہمیشہ ہر حال میں رونما ہوگا، خواہ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ یہ معاملہ کرے یا ایک شخص دوسرے شخص کے ساتھ۔ انگلستان کے لوگ یہ ماننے کے لئے تیار نہ تھے اور آج بھی وہ سرے سے نہیں مانتے کہ انفرادی معاملات میں سودی لین دین کوئی بری چیز ہے۔ آپ کسی انگریز سے بلاسودی قرض کی بات کریں۔ وہ فوراً آپ کو جواب دے گا کہ جناب یہ عملی کاروبار (Practial Business) کا طریقہ نہیں ہے۔ لیکن جب اس کی قومی مصیبت کے موقع پر اس کی ہمسایہ قوم نے اس کے ساتھ ”یہ عملی“ کاروبار کا طریق برتا تو ہر انگریز چیخ اٹھا اور اس نے تمام دنیا کے سامنے اس حقیقت پر گواہی دی کہ سود دلوں کو پھاڑنے والی اور تعلقات کو خراب کرنے والی چیز ہے۔

معاشی نقصانات

اب اس کے معاشی پہلو پر نگاہ ڈالیے۔ سود کا تعلق معاشی زندگی کے اُن معاملات سے ہے جن میں کسی نہ کسی صورت پر قرض کا لین دین ہوتا ہے۔ قرض مختلف اقسام کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم کے قرضے وہ ہیں جو حاجت مند لوگ اپنی ذاتی ضروریات کے لئے لیتے ہیں۔ دوسری قسم کے قرضے وہ ہیں جو تاجر اور صناع اور زمیندار اپنے نفع آور

کاموں میں استعمال کرنے کے لئے لیتے ہیں۔ تیسری قسم ان قرضوں کی ہے جو حکومتیں اپنے اہل ملک سے لیتی ہیں، اور اُن کی نوعیتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض قرضے غیر نفع آور اغراض کے لئے ہوتے ہیں مثلاً جنگی قرضے۔ اور بعض نفع آور اغراض کے لئے ہوتے ہیں، مثلاً وہ جو نہریں اور ریلیں اور برقِ آبی کی اسکیمیں جاری کرنے کے لئے حاصل کیئے جاتے ہیں۔ چوتھی قسم اُن قرضوں کی ہے جو حکومتیں اپنی ضروریات کی خاطر غیر ممالک کے بازارِ زر سے لیتی ہیں۔ ہم ان میں سے ہر ایک کو الگ الگ لے کر دیکھیں گے کہ اس پر سود عائد ہونے کے نقصانات کیا ہیں۔

اہل حاجت کے قرضے

دنیا میں سب سے بڑھ کر سُود خواری اُس کاروبار میں ہوتی ہے جو مہاجنی کاروبار (Lending Business) کہلاتا ہے۔ یہ بلا صرف برعظیم ہند تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ایک عالمگیر بلا ہے جس سے دنیا کا کوئی ملک بچا ہوا نہیں ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں کہیں بھی یہ انتظام نہیں ہے کہ غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں کو ان کی ہنگامی ضروریات کے لئے آسانی سے قرض مل جائے اور بلا سُود نہیں تو کم از کم تجارتی شرحِ سُود ہی پر نصیب ہو جائے۔ حکومت اسے اپنے فرائض سے خارج سمجھتی ہے۔ سوسائٹی کو اِس ضرورت کا احساس نہیں۔ بینک صرف ان کاموں میں ہاتھ ڈالتے ہیں جن میں ہزاروں لاکھوں کے وارے نیارے ہوتے ہیں۔ اور ویسے بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک قلیل المعاش آدمی اپنی کسی فوری ضرورت کے لئے بینک تک پہنچ سکے اور اس سے قرض حاصل کر سکے۔ ان وجوہ سے مزدور، کسان، چھوٹے چھوٹے کاروباری آدمی، کم تنخواہوں والے ملازم اور عام غریب لوگ ہر ملک میں مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے بُرے وقت پر اُن مہاجنوں سے قرض لیں جو اپنی بستیوں کے قریب ہی ان کو گِدھ کی طرح شکار کی تلاش میں منڈلاتے ہوئے مل جاتے ہیں۔ اس کاروبار میں اتنی بھاری شرحِ سُود رائج ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ سودی قرض کے جال میں پھنس جاتا ہے وہ پھر اس سے نہیں نکل سکتا، بلکہ دادا کا لیا ہوا قرض پوتوں تک وراثت میں منتقل ہوتا چلا جاتا ہے اور اصل سے کئی گنا سود ادا کر چکنے پر بھی اصل قرض کی چٹان جوں کی توں آدمی کے سینے پر دھری رہتی ہے۔ پھر بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر قرض دار کچھ مدت تک سود ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتا تو چڑھے ہوئے سُود کی رقم کو اصل میں شامل کر کے وہی مہاجن اپنا ہی قرض و سُود وصول کرنے کے لئے اسی شخص کو ایک اور بڑا قرض زیادہ شرحِ سُود پر دے دیتا ہے اور وہ غریب پہلے سے زیادہ زیر بار ہو جاتا ہے۔ انگلستان میں اس کاروبار کی کم سے کم شرحِ سود ۴۸ فی صدی سالانہ ہے جو از روئے قانون دلوائی جاتی ہے۔ لیکن عام شرح جس پر وہاں یہ کاروبار چل رہا ہے ۲۵۰ سے ۴۰۰ فیصدی

سالانہ تک ہے اور ایسی مثالیں بھی پائی گئی ہیں جن میں بارہ تیرہ سو فی صدی سالانہ پر معاملہ ہوا ہے۔ امریکہ میں مہاجنوں کے لئے قانونی شرح سود ۳۰ سے ۶۰ فیصدی سالانہ تک ہے، لیکن ان کا عام کاروبار ۱۰۰ سے ۲۶۰ فی صدی تک سالانہ شرح پر ہو رہا ہے اور بارہا یہ شرح ۴۸۰ فیصدی تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ خود ہمارے اس برعظیم میں بڑا ہی نیک طبع ہے وہ مہاجن جو کسی غریب کو ۲۴ فیصدی سالانہ پر قرض دے دے، ورنہ عام شرح ۵۰ فیصدی سالانہ ہے جو بارہا ۱۵۰ فی صدی تک بھی پہنچ جاتی ہے، بلکہ ۳۰۰ اور ۳۵۰ فی صدی سالانہ شرح کی مثالیں بھی پائی گئی ہیں۔

یہ وہ بلائے عظیم ہے جس میں ہر ملک کے غریب اور متوسط الحال طبقوں کی بڑی اکثریت بُری طرح پھنسی ہوئی ہے۔ اسکی وجہ سے قلیل المعاش کارکنوں کی آمدنی کا بڑا حصہ مہاجن لے جاتا ہے۔ شب وروز کی ان تھک محنت کے بعد جو تھوڑی سی تنخواہیں یا مزدوریاں اُن کو ملتی ہیں ان میں سے سود ادا کرنے کے بعد ان کے پاس اتنا بھی نہیں بچتا کہ وہ دو وقت کی روٹی چلا سکیں۔ یہ چیز صرف یہی نہیں کہ ان کے اخلاق کو بگاڑتی اور انہیں جرائم کی طرف دھکیلتی ہے اور صرف یہی نہیں کہ ان کے معیارِ زندگی کو پست اور ان کی اولاد کے معیارِ تعلیم و تربیت کو پست تر کر دیتی ہے، بلکہ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ دائمی فکر اور پریشانی ملک کے عام کارکنوں کی قابلیتِ کار کو بہت گھٹا دیتی ہے اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی محنت کا پھل دوسرا لے اڑتا ہے تو اپنے کام سے ان کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے سودی کاروبار کی یہ قسم صرف ایک ظلم ہی نہیں ہے بلکہ اس میں اجتماعی معیشت کا بھی بڑا بھاری نقصان ہے۔ یہ کیسی عجیب حماقت ہے کہ جو لوگ ایک قوم کے اصل عاملین پیدائش ہیں اور جن کی محنتوں ہی سے وہ ساری دولت پیدا ہوتی ہے جس پر قوم کی اجتماعی خوشحالی کا مدار ہے، قوم ان پر بہت سی جونکیں مسلط کیے رکھتی ہے جو ان کا خون چوس چوس کر ان کو نڈھال کرتی رہتی ہیں۔ تم حساب لگاتے ہو کہ ملیریا سے اتنے لاکھ عملی گھنٹوں کا نقصان ہو جاتا ہے اور اسکی وجہ سے ملک کی معاشی پیداوار میں اتنی کمی واقع ہوتی ہے۔ اس بنا پر تم مچھروں پر پل پڑے ہو اور ان کا قلع قمع کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ لیکن تم اس کا حساب نہیں لگاتے کہ تمہارے سود خوار مہاجن تمہارے لاکھوں کارکنوں کو کتنا پریشان، کتنا بددل اور کتنا افسردہ کرتے رہتے ہیں، کس قدر ان کے جذبۂ عمل کو سرد اور ان کی قوتِ کار کو کم کر دیتے ہیں، اور اس کا کتنا برا اثر تمہاری معاشی پیداوار پر مترتب ہوتا ہے۔ اس معاملہ میں تمہارے التفاتِ معکوس کا حال یہ ہے کہ تم ان مہاجنوں کا قلع قمع کرنے کے بجائے الٹا ان کے قرض داروں کو پکڑتے

ہو اور جو خون مہاجن خود اُن کے اندر سے نہیں سونت سکتا اسے تمہاری عدالتیں نچوڑ کر مہاجن کے حوالہ کرتی ہیں۔

اس کا دوسرا معاشی نقصان یہ ہے کہ اس طرح غریب طبقے کی رہی سہی قوتِ خریداری بھی سود خوار ساہوکار چھین لے جاتا ہے۔ لاکھوں آدمیوں کی بے روزگاری اور کروڑوں آدمیوں کی ناکافی آمدنی پہلے ہی تجارت و صنعت کے فروغ میں مانع تھی۔ اس پر تم نے اچھی آمدنیاں رکھنے والوں کو یہ راستہ دکھایا کہ وہ خرچ نہ کریں بلکہ زیادہ سے زیادہ رقم پس انداز کیا کریں۔ اس سے کاروبار کو ایک نقصان اور پہنچا۔ اب اس سب پر مستزاد یہ ہے کہ لاکھوں کروڑوں غریب آدمیوں کو ناکافی تنخواہوں اور مزدوریوں کی شکل میں جو تھوڑی بہت قوتِ خریداری حاصل ہو جاتی ہے اسکو بھی وہ اپنی ضروریاتِ زندگی خریدنے میں استعمال نہیں کرنے پاتے بلکہ اس کا ایک بڑا حصہ ساہوکار اُن سے چھین لیتا ہے اور اسکو اشیاء اور خدمات کی خریداری پر صرف کرنے کے بجائے سوسائٹی کے سر پر مزید سود طلب قرض چڑھانے میں استعمال کرتا ہے۔ ذرا حساب لگا کر دیکھئے۔ اگر دنیا میں ۵ کروڑ آدمی بھی ایسے ہیں جو مہاجنوں کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں، اور وہ اوسطاً ۱ روپے مہینہ سود ادا کر رہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر مہینے ۵ کروڑ روپے کا مال فروخت ہونے سے رہ جاتا ہے اور اتنی بھاری رقم معاشی پیداوار کی طرف پلٹنے کے بجائے مزید سودی قرضوں کی تخلیق میں دوبارہ صرف ہوتی رہتی ہے[1]۔

کاروباری قرض

اب دیکھئے کہ جو قرض تجارت و صنعت اور دوسری کاروباری اغراض کے لئے لیا جاتا ہے اُس پر سود کو جائز قرار دینے کے معاشی نقصانات کیا ہیں۔ صنعت، تجارت، زراعت اور دوسرے تمام معاشی کاموں کی بہتری یہ چاہتی ہے کہ جتنے لوگ بھی کسی کاروبار کے چلانے میں کسی طور پر حصہ لے رہے ہوں ان سب کے مفاد، اغراض اور دلچسپیاں اُس کام کے فروغ سے وابستہ ہوں۔ اس کا نقصان سب کا نقصان ہو تاکہ وہ اس کے خطرے سے بچنے کی مشترک سعی کریں، اور اس کا فائدہ سب کا فائدہ ہو تاکہ وہ اسکو بڑھانے میں اپنی پوری طاقت صرف

[1] اس جگہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۴۵ء قبل تقسیم کے ہندوستان کے متعلق اندازہ کیا گیا تھا کہ اس ملک کے مہاجنی قرضے کم از کم دس ارب روپے تک پہنچے ہوئے تھے۔ یہ صرف ایک ملک کا حال ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ساری دنیا میں اس نوعیت کے قرضوں کی مجموعی مقدار کیا ہوگی اور جو شرحِ سود اس کاروبار میں رائج ہے اس کے لحاظ سے ماہانہ کس قدر سود مہاجنوں کے پاس پہنچتا ہوگا۔

کر دیں۔ اس لحاظ سے معاشی مفاد کا تقاضا یہ تھا کہ جو لوگ کاروبار میں دماغی یا جسمانی کارکن کی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف سرمایہ فراہم کرنے والے فریق کی حیثیت سے شریک ہوں ان کی شرکت بھی اسی نوعیت کی ہوتا کہ وہ کاروبار کی بھلائی برائی سے وابستہ رہیں اور وہ اس کے فروغ میں اور اس کو نقصان سے بچانے میں پوری دلچسپی لیں۔ مگر جب قانون نے سود کو جائز کر دیا تو صاحب سرمایہ لوگوں کے لئے یہ راستہ کھل گیا کہ وہ اپنا سرمایہ شریک اور حصہ دار کی حیثیت سے کاروبار میں لگانے کے بجائے دائن کی حیثیت سے بصورت قرض دیں اور اس پر ایک مقرر شرح کے مطابق اپنا منافع وصول کرتے رہیں۔ اس طرح سوسائیٹی کے معاشی عمل میں ایک ایسا نرالا غیر فطری عامل آکر مل جاتا ہے جو تمام عاملینِ پیدائش کے برعکس اس پورے عمل کی بھلائی برائی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ اس عمل میں نقصان آرہا ہو تو سب کے لئے خطرہ ہے مگر اُس کے لئے نفع کی گارنٹی ہے، اس لئے سب تو نقصان کو روکنے کی کوشش کریں گے، مگر یہ اُس وقت تک فکرمند نہ ہوگا جب تک کہ کاروبار کا بالکل ہی دیوالہ نہ نکلنے لگے۔ نقصان کے موقعہ پر یہ کاروبار کو بچانے کے لئے مدد کو نہیں دوڑے گا بلکہ اپنے مالی مفاد کو بچانے کے لئے اپنا دیا ہوا روپیہ بھی کھینچ لینا چاہیگا۔ اسی طرح معاشی پیداوار کے عمل کو فروغ دینے سے بھی براہ راست اسے کوئی دلچسپی نہ ہوگی، کیونکہ اس کا نفع تو بہرحال مقرر ہے۔ پھر آخر وہ کیوں اس کام کی ترقی و کامیابی کے لئے اپنا سر کھپائے؟ غرض سوسائٹی کے نفع اور نقصان سے بے تعلق ہوکر یہ عجیب قسم کا معاشی عامل الگ بیٹھا ہوا صرف اپنے سرمایہ کو "کرایہ" پر چلاتا رہتا ہے اور بے کھٹکے اپنا مقرر "کرایہ" وصول کرتا رہتا ہے۔

اس غلط طریقہ نے سرمایہ اور کاروبار کے درمیان رفاقت اور ہمدردانہ تعاون کے بجائے ایک بہت ہی بری طرح کا خود غرضانہ تعلق قائم کر دیا ہے۔ جو لوگ بھی روپیہ جمع کرنے اور معاشی پیداوار کے کام پر لگانے کے مواقع رکھتے ہیں وہ اس روپے سے نہ خود کوئی کاروبار کرتے ہیں، نہ کاروبار کرنے والوں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں؛ بلکہ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کا روپیہ ایک مقررہ منافع کی ضمانت کے ساتھ قرض کے طور پر کام میں لگے، اور پھر وہ مقررہ منافع بھی زیادہ سے زیادہ شرح پر ہو۔ اس کے بے شمار نقصانات میں سے چند نمایاں ترین یہ ہیں:-

(۱) سرمایہ کا ایک معتد بہ حصہ، اور بسا اوقات بڑا حصہ محض شرح سود چڑھنے کے انتظار میں رُکا پڑا رہتا

ہے اور کسی مفید کام میں نہیں لگتا۔ باوجودیکہ قابل استعمال وسائل بھی دنیا میں موجود ہوتے ہیں، روزگار کے طالب آدمی بھی کثرت سے مارے مارے پھر رہے ہوتے ہیں، اور اشیاء ضرورت کی مانگ بھی موجود ہوتی ہے، لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے نہ وسائل استعمال ہونے ہیں، نہ آدمی کام پر لگتے ہیں اور نہ منڈیوں میں حقیقی طلب کے مطابق مال کی کھپت ہوتی ہے، صرف اس لئے کہ سرمایہ دار جس شرح سے فائدہ لینا چاہتا ہے اس کے ملنے کی اسے توقع نہیں ہوتی اور اس بنا پر وہ کام میں لگانے کے لئے روپیہ نہیں دیتا۔

(۲) زیادہ شرح سود کا لالچ ہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر سرمایہ دار طبقہ کاروبار کی طرف سرمایہ کے بہاؤ کو خود کاروبار کی حقیقی ضرورت اور طبعی مانگ کے مطابق نہیں بلکہ اپنے مفاد کے لحاظ سے روکتا اور کھولتا رہتا ہے۔ اس کا نقصان کچھ اسی طرح کا ہے جیسے کوئی نہر کا مالک کھیتوں اور باغوں کی مانگ اور ضرورت کے مطابق پانی نہ کھولے اور نہ بند کرے، بلکہ اپنے پانی کے کھولنے اور بند کرنے کا ضابطہ یہ بنا لے کہ جب پانی کی ضرورت نہ ہو تو وہ بے تحاشا پانی بڑے سستے داموں چھوڑنے کے لئے تیار ہو جائے، اور جونہی کہ پانی کی مانگ بڑھنی شروع ہو وہ اس کے ساتھ ساتھ پانی کی قیمت چڑھاتا چلا جائے یہاں تک کہ اس قیمت پر پانی لے کر کھیتوں اور باغوں میں لگانا کچھ بھی نفع بخش نہ رہے۔

(۳) سود اور اسکی شرح ہی وہ چیز ہے جس کی بدولت تجارت وصنعت کا نظام ایک ہموار طریقہ سے چلنے کے بجائے تجارتی چکر کی اس بیماری میں مبتلا ہوتا ہے جس میں اس پر بار بار کساد بازاری کے دورے پڑتے ہیں۔ اسکی تشریح ہم پہلے کر چکے ہیں اس لئے یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

(۴) پھر یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے کہ سرمایہ اُن کاموں کی طرف جانے کے لئے راضی نہیں ہوتا جو مصالح عامّہ کے لئے مفید اور ضروری ہیں مگر مالی لحاظ سے اتنے نفع بخش نہیں ہیں کہ بازار کی شرح سود کے مطابق فائدہ دے سکیں اس کے برعکس وہ غیر ضروری مگر زیادہ نفع آور کاموں کی طرف بہ نکلتا ہے اور اُدھر بھی وہ کارکنوں کو مجبور کرتا ہے کہ شرح سود سے زیادہ کمانے کے لئے ہر طرح کے بھلے اور برے اور صحیح وغلط طریقے استعمال کریں۔ اس نقصان کی تشریح بھی ہم پہلے کر آئے ہیں اس لئے اس کو دُہراتے کی ضرورت نہیں۔

(۵) سرمایہ دار لمبی مدت کے لئے سرمایہ دینے سے پہلو تہی کرتے ہیں، کیونکہ ایک طرف وہ سٹہ بازی کے لئے اچھا خاصہ سرمایہ ہر وقت اپنے پاس قابل استعمال رکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف انہیں یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ اگر آئندہ کبھی شرح سُود زیادہ چڑھی تو ہم اس وقت کم سود پر زیادہ سرمایہ پھنسا دینے سے نقصان میں رہیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اہل صنعت وحرفت بھی اپنے سارے کاروبار میں تنگ نظری و کم حوصلگی کا طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور مستقل بہتری کے لئے کچھ کرنے کے بجائے بس چلتا کام کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ مثلاً ایسے قلیل المدت سرمایہ کو لے کر ان کے لئے یہ بہت مشکل ہوتا ہے کہ اپنی صنعت کے لئے جدید ترین آلات اور مشینیں خریدنے پر کوئی بڑی رقم خرچ کر دیں۔ بلکہ وہ پرانی مشینوں ہی کو گھس گھس کر بھلا برا مال مارکیٹ میں پھینکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں تاکہ قرض وسود ادا کر سکیں اور کچھ اپنا منافع بھی پیدا کر لیں۔ اسی طرح یہ بھی ان قلیل المدت قرضوں ہی کی برکت ہے کہ منڈی سے مال کی مانگ کم آتے دیکھ کر فوراً ہی کارخانہ دار مال کی پیداوار گھٹا دیتا ہے اور ذرا سی دیر کے لئے بھی پیداوار کی رفتار کو علیٰ حالہٖ برقرار رکھنے کی ہمت نہیں کر سکتا، کیونکہ اسے خطرہ ہوتا ہے کہ اگر بازار میں مال کی قیمت گر گئی تو وہ پھر بالکل دیوالہ کی سرحد پر ہوگا۔

(۶) پھر جو سرمایہ بڑی صنعتی وتجارتی اسکیموں کے لئے لمبی مدت کے واسطے ملتا ہے اس پر بھی ایک خاص شرح کے مطابق سود عائد ہونا بڑے نقصانات کا موجب ہوتا ہے۔ اس طرح کے قرضے بالعموم دس، بیس یا تیس سال کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں اور اس پوری مدت کے لئے ابتدا ہی میں ایک خاص فی صدی سالانہ شرح سود طے ہو جاتی ہے۔ اس شرح کا تعین کرتے وقت کوئی لحاظ اس امر کا نہیں کیا جاتا، اور جب تک فریقین کو علم غیب نہ ہو کیا جا بھی نہیں سکتا، کہ آئندہ دس بیس یا تیس سال کے دوران میں قیمتوں کا اتار چڑھاؤ کیا شکل اختیار کرے گا اور قرض لینے والے کے لئے نفع کے امکانات کس حد تک کم یا زیادہ ہوں گے یا بالکل نہ رہیں گے۔ فرض کیجئے کہ آج ایک شخص ۲۰ سال کے لئے ۶ فی صدی شرح سود پر ایک بھاری قرض حاصل کرتا ہے اور اس سے کوئی بڑا کام شروع کرتا ہے۔ اب وہ مجبور ہے کہ ۶۹ ۱۹ء تک ہر سال باقاعدگی کے ساتھ ایک طے شدہ حساب سے اصل کی اقساط اور سود ادا کرتا رہے۔

لیکن اگر ششم تک پہنچتے پہنچتے قیمتیں گر کر موجودہ نرخ سے آدھی رہ جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص جب تک موجودہ حالت کی بہ نسبت اُس وقت دوگنا مال نہ بیچے وہ نہ اس رقم کا سود ادا کر سکتا ہے اور نہ قرضہ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اُس انحطاط کے دور میں یا تو اس قسم کے اکثر قرض دار دل کے دیوالے نکل جائیں، یا وہ دیوالے سے بچنے کے لئے معاشی نظام کو خراب کرنے والی ناجائز حرکات میں سے کوئی حرکت کریں۔ اس معاملہ پر اگر غور کیا جائے تو کسی معقول آدمی کو اس امر میں کوئی شک نہ رہے گا کہ مختلف زمانوں میں چڑھتی اور گرتی ہوئی قیمتوں کے درمیان قرض دینے والے سرمایہ دار کا وہ منافع جو تمام زمانوں میں یکساں رہے نہ انصاف ہے اور نہ معاشیات کے اصولوں ہی کے لحاظ سے اسکو کسی طرح درست اور اجتماعی خوشحالی میں مددگار ثابت کیا جا سکتا ہے۔ کیا دنیا میں کہیں آپ نے یہ سنا ہے کہ کوئی کمپنی جو اشیائے ضرورت میں سے کسی چیز کی فراہمی کا ٹھیکہ لے رہی ہو، یہ معاہدہ کرے کہ وہ آئندہ تیس سال یا بیس سال تک یہ چیز اسی قیمت پر خریدار کو مہیا کرتی رہیگی؟ اگر یہ کسی لمبی مدت کے سودے میں ممکن نہیں ہے، تو آخر صرف سودی قرض دینے والا سرمایہ دار ہی وہ انوکھا سوداگر کیوں ہو جو برسہا برس کی مدت کے لئے اپنے قرض کی قیمت پیشگی طے کر لے اور وہی وصول کرتا چلا جائے۔

حکومتوں کے ملکی قرضے اب اُن قرضوں کو لیجئے جو حکومتیں اپنی ضروریات اور مصالح کے لئے خود اپنے ملک کے لوگوں سے لیتی ہیں۔ ان میں سے ایک قسم وہ ہے جو غیر نفع آور کاموں کے لئے لی جاتی ہے، اور دوسری قسم وہ جو نفع آور کاموں میں لگائی جاتی ہے۔

پہلی قسم کے قرضوں پر سود اپنی نوعیت کے لحاظ سے وہی معنی رکھتا ہے جو اہل حاجت افراد کے ذاتی قرضوں پر سود کی نوعیت ہے۔ بلکہ درحقیقت یہ اس سے بھی بدتر چیز ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص جس کو ایک معاشرے نے جنم دیا، پالا پوسا، اس قابل بنایا کہ وہ کچھ کما سکے، خطرات سے اسکی حفاظت کی، نقصانات سے اسکو بچایا، اور معاشرے کے تمدنی و سیاسی اور معاشی نظام نے اُن تمام خدمات کا انتظام کیا جن کی بدولت وہ آمن سے بیٹھا اپنا کاروبار چلا رہا ہے، وہ اُسی معاشرے کو اُن ضرورتوں کے موقع پر جن میں کسی مالی نفع کا کوئی سوال نہیں ہے اور جن کے پورا ہونے سے سب لوگوں کے ساتھ خود اس شخص کا

مفاد بھی وابستہ ہے، بلا سود روپیہ قرض دینے پر آمادہ نہیں ہوتا اور خود اپنے عزیز معاشرے سے کہتا ہے کہ تو چاہے اس روپے سے کوئی نفع کمائے یا نہ کمائے، مگر میں تو اپنی رقم کا اتنا معاوضہ سالانہ ضرور لیتا رہوں گا۔

یہ معاملہ اُس وقت اور بھی زیادہ سنگین ہو جاتا ہے جب کہ قوم کو جنگ پیش آئے اور سب کے ساتھ خود اس سرمایہ دار فرزندِ قوم کی اپنی جان، مال اور آبرو کی حفاظت کا سوال بھی درپیش ہو۔ ایسے موقع پر جو کچھ بھی قومی خزانے سے خرچ ہوتا ہے وہ کسی کاروبار میں نہیں لگتا بلکہ آگ میں پھونک دیا جاتا ہے۔ اس میں منافع کا کیا سوال؟ اور یہ خرچ اس کام میں ہوتا ہے جس کی کامیابی و ناکامی پر ساری قوم کے ساتھ خود اس شخص کی اپنی موت و زیست کا بھی انحصار ہے۔ اور اس کام میں قوم کے دوسرے لوگ اپنی جانیں اور وقت اور محنت سب کچھ کھپا رہے ہوتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی یہ سوال نہیں کرتا کہ قومی دفاع کے لیے جو حصہ میں ادا کر رہا ہوں اس پر کتنا منافع سالانہ مجھ کو ملتا رہے گا۔ مگر پوری قوم میں سے صرف ایک سرمایہ دار ہی ایسا نکلتا ہے جو اپنا مال دینے سے پہلے یہ شرط کرتا ہے کہ مجھے ہر روپے پر اتنا منافع ہر سال ملنا چاہیے اور میرا یہ منافع اس وقت تک لگنا چاہیے جب تک ساری قوم مل کر میری دی ہوئی اصل رقم مجھے واپس نہ کر دے، خواہ اس میں ایک صدی ہی کیوں نہ لگ جائے، اور میرا یہ منافع اُن لوگوں کی جیبوں میں سے بھی آنا چاہیے جنہوں نے ملک اور قوم کی اور خود میری حفاظت کے لئے اپنے ہاتھ پاؤں کٹوائے یا اپنے بیٹے، باپ، بھائی یا شوہر مفت کھو دیئے[1]!

سوال یہ ہے کہ ایک معاشرے میں ایسا طبقہ آیا اس کا مستحق ہے کہ اسے سود کھلا کھلا کر پالا جائے یا اس کو گدڑ سے اُس زہر کی گولیاں کھلائی جائیں جن سے کتے مارے جاتے ہیں؟

رہے دوسری قسم کے قرضے تو ان کی نوعیت اُن قرضوں سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے جو عام افراد

---

[1] اس موقع پر یہ معلوم کرنا لطف سے خالی نہ ہوگا کہ انگلستان کے باشندے آج تک اپنے سرمایہ داروں کو اُن جنگی قرضوں کا سود ادا کیے جا رہے ہیں جو اب سے سوا سو برس پہلے اُن کے بزرگوں نے نپولین سے لڑنے کے لئے حاصل کیے تھے۔ اور امریکہ کے باشندے اُس رقم سے چوگنی رقم اب تک ادا کر چکے ہیں جو امریکن سول وار کے مصارف کے لئے ۱۸۶۱-۶۵ء میں قرض لی گئی تھی اور ابھی اُن کے ذمہ مزید ایک عرب ڈالر قریب اصل و سود واجب الادا ہے!

اور ادارے کاروباری اغراض کے لئے لیتے ہیں، لہٰذا ان پر بھی وہ سب اعتراضات وارد ہوتے ہیں جو اوپر ہم نے کاروباری قرضوں کے سود پر کیے ہیں عموماً حکومتیں نفع آور کاموں پر لگانے کے لئے لمبی مدت کے قرض لیتی ہیں۔ مگر کوئی حکومت بھی ایک مقرر شرح سود پر قرض لیتے وقت یہ نہیں جانتی کہ آئندہ بیس تیس سال کے دوران میں ملک کے اندرونی حالات اور دنیا کے بین الاقوامی معاملات کیا رنگ اختیار کریں گے اور ان میں اُس کام کی نفع آوری کا کیا حال رہے گا جس پر خرچ کرنے کے لئے وہ یہ سودی قرض لے رہی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حکومت کے اندازے غلط نکلتے ہیں اور وہ کام شرح سود کے برابر بھی نفع نہیں دیتا کجا کہ اس سے زیادہ۔ یہ اُن بڑے اسباب میں سے ایک ہے جن کی وجہ سے حکومتیں مالی مشکلات میں مبتلا ہوتی ہیں اور ان کے لئے پچھلے ہی قرضوں کے اصل و سود ادا کرنے مشکل ہو جاتے ہیں کجا کہ وہ مزید نفع آور تجاویز پر مزید سرمایہ لگا سکیں۔

علاوہ بریں یہاں بھی وہی صورت پیش آتی ہے جس کی طرف ہم پہلے کئی بار اشارہ کر چکے ہیں کہ بازاری شرح سود ایک ایسی حد مقرر کر دیتی ہے جس سے کم نفع دینے والے کسی کام پر سرمایہ نہیں لگایا جا سکتا خواہ وہ کام پبلک کے لئے کتنا ہی ضروری اور مفید ہو۔ غیر آباد علاقوں کی آبادکاری، بنجر زمینوں کی درستی، خشک علاقوں میں آب پاشی کے انتظامات، دیہات میں سڑکوں اور روشنی اور حفظان صحت کا بندوبست، کم تنخواہیں پانے والے ملازموں کے لئے صحت بخش مکانات کی تعمیر، اور ایسے ہی دوسرے کام اپنی جگہ چاہے کتنے ہی ضروری ہوں اور ان کے نہ ہونے سے چاہے ملک اور قوم کا کتنا ہی نقصان ہو، مگر کوئی حکومت ان پر روپیہ صرف نہیں کر سکتی جب کہ اُن سے اتنا نفع حاصل ہونے کی توقع نہ ہو جو رائج الوقت شرح سود کے برابر یا اس سے زیادہ ہو سکے۔

پھر اس قسم کے جن کاموں پر سرمایہ لگایا جاتا ہے ان کے معاملہ میں بھی حقیقی صورتِ حال کیا ہوتی ہے؟ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ حکومت اُس کے سود کا بار عام باشندوں پر ڈال دیتی ہے ٹیکسوں کے ذریعہ سے ہر شخص کی جیب سے بالواسطہ یا بلاواسطہ یہ سود نکالا جاتا ہے، اور سال کے سال لاکھوں روپے کی رقمیں جمع کر کر کے سرمایہ داروں کو مدتہائے دراز تک پہنچائی جاتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ ۵ کروڑ کے سرمایہ سے آب پاشی کی ایک بڑی اسکیم عمل میں لائی جاتی ہے، اور یہ سرمایہ ۶ فی صدی سالانہ شرح پر حاصل کیا جاتا ہے۔ اس حساب سے حکومت کو ہر سال ۳۰ لاکھ روپیہ سود ادا کرنا ہوگا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ حکومت اتنی بڑی رقم کہیں سے زمین کھود کر نہیں نکالیگی،

بلکہ اس کا بار اُن زمینداروں پر ڈالے گی جو آب پاشی کے اس منصوبے سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہر زمیندار پر جو آبیانہ لگایا جائے گا اس میں ایک حصہ لازماً اس سود کی مد کا بھی ہوگا۔ اور زمیندار خود بھی یہ سود اپنی گرہ سے نہیں دے گا بلکہ وہ اس کا بار غلے کی قیمت پر ڈالے گا۔ اس طرح یہ سود بالواسطہ ہر اُس شخص سے وصول کیا جائے گا جو اس غلے کی روٹی کھائے گا۔ ایک ایک غریب اور فاقہ کش آدمی کی روٹی میں سے لازماً ایک ایک ٹکڑا توڑا جائے گا اور اُن سرمایہ داروں کے پیٹ میں ڈالا جائے گا جنہوں نے ۳۰ لاکھ روپیہ سالانہ سود پر اس منصوبے کے لئے قرض دیا تھا۔ اگر حکومت کو یہ قرض ادا کرتے کرتے ۵۰ برس لگ جائیں تو وہ غریبوں سے چندہ جمع کر کے امیروں کی مدد کرنے کا یہ فریضہ نصف صدی تک برابر انجام دیتی چلی جائے گی، اور اس سارے معاملے میں خود اُس کی حیثیت مہاجن کے منیم جی سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہ ہوگی۔

یہ عمل اجتماعی معیشت میں دولت کے بہاؤ کو ناداروں سے مالداروں کی طرف پھیر دیتا ہے حالانکہ جماعت کی فلاح کا تقاضا یہ ہے کہ وہ مالداروں سے ناداروں کی طرف جاری ہو۔ یہ خرابی صرف اُسی سود میں نہیں ہے جو حکومتیں نفع آور قرضوں پر ادا کرتی ہیں بلکہ اُن سارے سودی معاملات میں ہے جو تمام کاروباری آدمی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی تاجر یا صناع یا زمیندار اپنی گرہ سے وہ سود ادا نہیں کرتا جو اسے سرمایہ دار کو دینا ہوتا ہے۔ وہ سب اس بار کو اپنے اپنے مال کی قیمتوں پر ڈالتے ہیں اور اس طرح عام لوگوں سے پیسہ پیسہ چندہ اکٹھا کر کے لکھ پتیوں اور کروڑ پتیوں کی جھولی میں پھینکتے رہتے ہیں۔ اس اوندھے نظام میں سب سے زیادہ "مدد کا مستحق" ملک کا سب سے بڑا دولت مند ساہوکار ہے، اور اسکی مدد کا فرض سب سے بڑھ کر جس شخص پر عائد ہوتا ہے وہ ملک کا وہ باشندہ ہے جو دن بھر اپنا خون پسینہ ایک کر کے ڈیڑھ روپیہ کما کر لائے اور پھر بھی اپنے نیم فاقہ کش بال بچوں کے لئے چٹنی اور روٹی کا انتظام کرنا اس پر حرام ہو جب تک کہ پہلے وہ اس چٹنی اور روٹی میں سے اپنے ملک کے سب سے بڑے "قابل رحم" کروڑ پتی کا "حق" نہ نکال دے۔

حکومتوں کے بیرونی قرضے آخری مد اُن قرضوں کی ہے جو حکومتیں اپنے ملک سے باہر کے ساہوکاروں سے لیتی ہیں اس قسم کے قرض بالعموم بہت بڑی بڑی رقموں کے لئے ہوتے ہیں جن کی مقدار کروڑوں سے گذر کر بسا اوقات اربوں اور کھربوں تک پہنچ جاتی ہے۔ حکومتیں ایسے قرضے زیادہ تر اُن حالات میں لیتی ہیں جب اُن کے ملک پر

غیر معمولی مشکلات اور مصائب کا ہجوم ہوتا ہے اور خود ملک کے مالی ذرائع ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کافی نہیں ہوتے۔ اور کبھی وہ اس لالچ میں بھی اس تدبیر کی طرف رجوع کرتی ہیں کہ بڑا سرمایہ لے کر تعمیری کاموں پر لگانے سے ان کے وسائل جلدی ترقی کر جائیں گے۔ ان قرضوں کی شرحِ سود ۶-۷ فی صدی سے لے کر ۹-۱۰ فیصدی تک ہوتی ہے اور اس شرح پر اربوں روپے کا سالانہ سود بھی کروڑوں روپے ہوتا ہے۔ بین الاقوامی بازارِ زر کے سیٹھ اور ساہوکار اپنی اپنی حکومتوں کو بیچ میں ڈال کر ان کی وساطت سے یہ سرمایہ قرض دیتے ہیں اور اس کے لیئے ضمانت کے طور پر قرض لینے والی حکومت کے محاصل میں سے کسی محصول مثلاً چنگی، تمباکو، شکر، نمک یا کسی اور مد کی آمدنی کو رہن رکھ لیتے ہیں۔

اس نوعیت کے سُودی قرضے اُن تمام خرابیوں کے حامل ہوتے ہیں جن کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں شخصی حاجات کے قرض اور کاروباری قرض اور حکومتوں کے اندرونی قرض اپنے اندر کوئی نقصان ایسا نہیں رکھتے جو ان بین الاقوامی قرضوں پر سود لگنے کے طریقہ میں موجود نہ ہو۔ اس لئے اُن خرابیوں اور نقصانات کا تو اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر قرض کی یہ قسم اُن سب کے ساتھ ایک اور خرابی بھی اپنے اندر رکھتی ہے جو اُن سب سے زیادہ خوفناک ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان قرضوں کی بدولت پوری پوری قوموں کی مالی حیثیت خراب اور معاشی حالت تباہ ہو جاتی ہے جس کا نہایت برا اثر ساری دنیا کی معاشی حالت پر پڑتا ہے، پھر ان کی بدولت قوموں میں عداوت اور دشمنی کے بیج پڑتے ہیں، اور آخر کار انہی کی بدولت آفت رسیدہ قوموں کے نوجوان دل برداشتہ ہو کر انتہا پسندانہ سیاسی، تمدنی اور معاشی فلسفوں کو قبول کرنے لگتے ہیں اور اپنے قومی مصائب کا حل ایک خونی انقلاب یا ایک تباہی خیز جنگ میں تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جس قوم کے مالی ذرائع پہلے ہی اپنی مشکلات یا اپنی ضرورتوں کو رفع کرنے کے لئے کافی نہ تھے، وہ آخر کس طرح اس قابل ہو سکتی ہے کہ ہر سال پچاس ساٹھ لاکھ یا کروڑ دو کروڑ روپیہ تو صرف سود میں ادا کرے اور پھر اس کے علاوہ اصل قرض کی اقساط بھی دیتی رہے۔ خصوصاً جب کہ اس کے ذرائع آمدنی میں سے کسی ایک بڑے اور زیادہ نفع بخش ذریعے کو تاک کر آپ نے پہلے ہی مکفول کر لیا ہو اور اس کی جان پہلے سے بھی زیادہ تنگ ہو کر رہ گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جو قوم کوئی بڑی رقم اس طور پر سودی قرض سے لیتی

ہے، بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ اسکی وہ مشکلات رفع ہوجائیں جن سے نکلنے کے لئے اس نے یہ قرض لیا تھا۔ اس کے برعکس اکثر یہی قرض اسکی مشکلات میں مزید اضافہ کا موجب ہوجاتا ہے۔ قرض کی اقساط اور سُود ادا کرنے کے لئے اسے اپنے افراد پر بہت زیادہ ٹیکس لگانا پڑتا ہے اور مصارف میں بہت زیادہ کمی کردینی ہوتی ہے۔ اس سے ایک طرف قوم کے عوام میں بے چینی بڑھتی ہے، کیونکہ جتنا وہ خرچ کرتے ہیں اس کا بدل ان کو اس خرچ کے ہم وزن نہیں ملتا۔ اور دوسری طرف اپنے ملک کے لوگوں پر اس قدر زیادہ بار ڈال دینے پر بھی حکومت کے لئے قرض کی اقساط اور سود باقاعدہ ادا کرتے رہنا مشکل ہوجاتا ہے۔ پھر جب قرض دار ملک کی طرف سے ادائیگی میں مسلسل کوتاہی صادر ہونے لگتی ہے تو بیرونی قرض خواہ اس پر الزام لگانا شروع کرتے ہیں کہ یہ بے ایمان ملک ہے، ہمارا روپیہ کھا جانا چاہتا ہے۔ ان کے اشاروں پر ان کے قومی اخبارات اس غریب ملک پر چوٹیں کرنے لگتے ہیں، پھر ان کی حکومت بیچ میں دخل انداز ہوتی ہے اور اپنے سرمایہ داروں کے حق میں اس پر صرف سیاسی دباؤ ہی ڈالنے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اسکی مشکلات کا ناجائز فائدہ بھی اٹھانا چاہتی ہے۔ قرض دار ملک کی حکومت اس پھندے سے نکلنے کے لئے کوشش کرتی ہے کہ ٹیکسوں میں مزید اضافہ اور مصارف میں مزید تخفیف کرکے کسی طرح جلدی سے جلدی اس سے چھٹکارا پائے۔ مگر اس کا اثر باشندگانِ ملک پر یہ پڑتا ہے کہ پیہم روزافزوں مالی بار اور معاشی تکلیفیں اٹھاتے اٹھاتے ان کے مزاج میں تلخی آجاتی ہے، بیرونی قرض خواہ کی چوٹوں اور سیاسی دباؤ پر اور زیادہ چڑ جاتے ہیں، اپنے ملک کے اعتدال پسند مدبّروں پر ان کا غصہ بھڑک اٹھتا ہے اور معاملہ فہم لوگوں کو چھوڑ کر وہ اُن انتہا پسند جُواریوں کے پیچھے چل پڑتے ہیں جو سارے قرضوں سے بیک جنبشِ زبان بری الذمہ ہوکر خم ٹھونک میدان میں آکھڑے ہوتے ہیں اور للکار کر کہتے ہیں کہ جس میں طاقت ہو وہ ہم سے اپنے مطالبات منوا لے۔

یہاں پہنچ کر سود کی شرانگیزی و فتنہ پردازی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ کیا اس پر بھی کوئی صاحبِ عقل و ہوش آدمی یہ ماننے میں تامل کرسکتا ہے کہ سود ایک ایسی برائی ہے جسے قطعی حرام ہونا چاہیئے؟ کیا اس کے یہ نقصانات اور یہ نتائج دیکھ لینے کے بعد بھی کسی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں شک ہوسکتا ہے کہ

الربا سبعون جزءا
أيسرها أن ينكح
الرجل أمه۔
(ابن ماجہ۔ بیہقی)

سود اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کو
اگر ستر اجزاء میں تقسیم کیا جائے تو
اس کا ایک ہلکے سے ہلکا جزء اس
گناہ کے برابر ہوگا کہ ایک آدمی اپنی
ماں کے ساتھ زنا کرے۔

ہمارا معاشرہ

چند خطرناک نفسیاتی وبائیں :

نعیم صدیقی

(۳)

اہلِ دین کا ایک بڑا گروہ ——— جو شاید دینداری کی حس بھی کچھ زیادہ ہی رکھتا ہے ——— ایک اور ہی زاویۂ نگاہ سے حالات کو دیکھتا ہے اور تیزی سے مایوسی کے گڑھے کی طرف لڑھک رہا ہے!

ہمارا اشارہ ایسے لوگوں کی طرف ہے جو قوم کی اجلِ مسمّٰی کے بالکل سر پر لٹک آنے کے قائل ہیں اور حالات کی اصلاح سے قطعی طور پر مایوس ہو کر عذاب کے ورود کے بالکل منتظر بیٹھے ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ مختلف جماعتیں ایک عرصے سے دین کا پیغام دے رہی ہیں۔ ملک میں مدت سے اسلامی لٹریچر پھیل رہا ہے، بے شمار حلقہ ہائے درس موجود ہیں، ہزارہا مساجد سے اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے آواز اٹھتی رہتی ہے ——— اور پھر ان کوششوں میں جو کمی تھی اسے پورا کرنے کے لئے تقسیم کا خونیں ہنگامہ ایک ہمہ گیر تنبیہ بن کے آیا ہے لیکن جو قوم اس کے بعد بھی اپنے حال پر قائم ہے، ناممکن ہے کہ اب اس کی اصلاح کی جا سکے اور اس کے نظامِ زندگی کو اسلام کی بنیادوں پر استوار کیا جا سکے۔ اس نظریے کے لوگوں کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ ہیں جو اصلاح کی کوششوں سے بے نیاز ہونے کا ایک اچھا بہانہ مل جانے کی وجہ سے اپنی دنیوی زندگی میں پورے اطمینان سے یکسو ہو چکے ہیں اور بزعمِ خویش آنے والے عذاب کے تماشائی بن کے بیٹھے ہیں۔ ان حضرات کے دلوں میں قوم کے خلاف بوجوہ ایک انتقامی جذبہ کروٹیں لے رہا ہے اور اس وجہ سے یہ اس بات کے خواہشمند ہیں کہ قوم شکارِ عذاب ہو اور پھر یہ کنارے بیٹھ کر اسے دیکھیں، لذت لیں، اور پھر یہ کہہ سکیں کہ دیکھو ہم نے بتا دیا تھا، اب مزہ چکھو! ——— جیسے خود یہ پوری طرح بری الذمہ ہو چکے ہیں اور ان کے پاس کوئی سند

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آ چکی ہے کہ تم کو بہرحال بچا لیا جائے گا۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو دین میں زیادہ انہماک رکھنے والے ہیں، زیادہ مخلص ہیں، اور اصلاح سے مایوس ہو کر اس فکر میں ہیں کہ تمدن کے ہنگاموں سے الگ ہو کر اپنے لئے کوئی ذہنی و روحانی پناہ گاہ تعمیر کریں اور آنے والے عذاب سے پہلے پہلے کہیں سر چھپانے کا کوئی انتظام کر لیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ ان دونوں قسم کے حضرات میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اپنی عام زندگی میں اس طرح کی قنوطیت میں مبتلا ہوتا ہو۔ ان میں سے کوئی بے روزگار ہوتا ہے تو حصولِ معاش کے لئے اپنی جدوجہد کو کبھی ختم نہیں کرتا، چاہے دو مہینے تک کامیابی کی کوئی صورت نہ پیدا ہو۔ ان میں سے کوئی اگر دکان کھول کے بیٹھتا ہے تو چاہے گھنٹوں کوئی گاہک نہ آئے لیکن وہ شام سے پہلے دروازہ بند کر کے نہیں اٹھتا، بلکہ اسے برابر انتظار رہتا ہے کہ شاید اب کوئی آ جائے۔ ان میں سے کسی کا بچہ بیمار ہو جاتا ہے تو چاہے مرض کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو اور معالجہ کی تدابیر کتنی ہی ناکام کیوں نہ ہوں۔ ہی ہوں بیمار کی جان بچانے کی کوشش کو وہ آخری سانس تک کبھی روکنے پر تیار نہیں ہوتا۔ لیکن ملت کی اصلاح اور اقامت دین کی جدوجہد ہی میں ان حضرات کے دل جلد ہارتے ہیں اور ہاتھ پاؤں جلد پھولتے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کو ملت سے دلسوزی کا اتنا گہرا تعلق ہے ہی نہیں کہ آخر دم تک تدابیر اصلاح کو اس پر آزماتے چلے جائیں اور کبھی نہ تھکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کی دلسوزی کے بغیر کبھی کوئی اصلاح کی کوشش پنپ نہیں سکتی۔

ان حضرات سے ہم چند گذارشات کرنا چاہتے ہیں:۔

اولاً تو آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ کا مقام نبی کا نہیں، بلکہ نبوت سے ہزار ہا درجے فروتر ہے۔ لہٰذا آپ کا منصب یہ ہے ہی نہیں کہ آپ ایک نبی کی طرح کسی قوم و ملک کے مستقبل پر کوئی قطعی حکم لگائیں۔

نبی کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ فوق البشری "آیات" اور دلائل و شواہد کے ساتھ آتا ہے، جن کے ذریعے وہ یہ ثابت کر دیتا ہے کہ حقیقتاً وہ اللہ کی طرف سے مبعوث و مامور ہے اور اس کی دعوت قطعی طور پر واجب القبول ہے جسے ٹھکرانا اپنی ہلاکت کا سامان کرنا ہے۔ دوسری طرف اس کا قول، اس کا فعل، اس کی سیرت، اس کا اخلاق، اس کی تحریک، اس کا طرز تعلیم، اس کا انداز تربیت، اس کی شان استدلال غرضیکہ اس کی سرگرمی، اصلاح

کا ہر پہلو ہر لحاظ سے کامل و اکمل ہوتا ہے۔ اس میں کوئی قابلِ گرفت کوتاہی نہیں ہوتی، اسکی تحریک میں کوئی جزئی سا تضاد اور کھوٹ بھی نہیں پایا جاتا، لہذا وہ اپنی زندگی میں لازماً "اتمامِ حجت" کا حق ادا کرکے جاتا ہے۔ نبی جس قوم سے براہ راست خطاب کرتا ہے، اس کے پاس آخرت میں پیش کرنے کے لئے یہ عذر باقی نہیں رہتا کہ ہم تک دعوتِ حق تھر کر نہ آئی تھی اور ہمیں اس کے پہچاننے میں کوئی دقت ہوئی تھی، بلکہ اس قوم کے لئے عذرات تراشی کے سارے راستے بند کر دیئے جاتے ہیں، وہ چاروں طرف سے دلائل سے گھیر دی جاتی ہے، چنانچہ وہ اگر آخر دم تک سرکشی پر ڈٹی رہتی ہے تو وہ اپنے جرمِ بغاوت پر خود ہمہ تن شہادت بن جاتی ہے اور اس حال میں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اس کے لئے عذاب مقدر ہو جاتا ہے!

لیکن نبی کا کوئی پیرو اتمامِ حجت کے وہ کامل وسائل نہیں رکھتا جو نبی کو اللہ کی طرف سے عطا ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک عام داعیٔ حق دعوتِ حق تو دے رہا ہو لیکن اس کا اسلوب معیاری نہ ہو، اسکی بات تبیین نہ ہو، وہ وقت کے ذہنی فتنوں کی جڑیں تلاش کر کرکے ذہنوں سے اکھیڑ نہ سکے، اسکی شخصیت میں جاذبیت کم ہو، اس کے اخلاق میں کسی پہلو سے کچھ کمی رہ جائے، اسے تربیتِ عوام کا ڈھنگ پوری طرح نہ آتا ہو، وہ ایک مدت سے صبر سے کام کرتے چلے جانے کے بجائے جی ہار کر ٹھنڈا پڑ جائے، غرضیکہ بے شمار کمزوریاں اور کوتاہیاں ایسی ہو سکتی ہیں جن کی وجہ سے ایک شخص دعوتِ حق دینے کا فریضہ تو انجام دیتا رہے لیکن اتمامِ حجت نہ کر سکے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اتمامِ حجت سے پہلے تباہ کن عذاب کے ورود کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اللہ کے قانونِ عذاب کی حقیقت پر نگاہ ہو!

علاوہ بریں ایک عام داعیٔ حق "آیاتِ بینات" اور معجزات اور سر کی آنکھوں سے نظر آنے والے دلائل و شواہد کہاں سے لائے گا، وہ تو نبی کے لئے خاص ہیں!

ان حالات میں کونسا داعیٔ حق ایسا ہو سکتا ہے جو یقین کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ میں نے اتمامِ حجت کا حق ادا کر دیا ہے اور وہ حالت پیدا ہو چکی ہے جسے قرآن نے یوں بیان کیا ہے کہ:۔

قد تبین الرشد من الغی	راستی روی کجروی کے مقابل میں واضح ہو چکی!
فمن یکفر بالطاغوت و	اب جو کوئی "طاغوت" کا انکار کرکے

یومن باللہ فقد استمسک	اللہ پر ایمان لایا اس نے ایک مضبوط
بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لها (البقرہ)	رشتہ تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

ہو سکتا ہے کہ ایک داعی اس حالت کے پیدا ہو جانے کے تصور میں ہو لیکن فی الواقع یہ پیدا نہ ہوئی ہو یا ابھی وہ اسے دور سمجھ رہا ہو اور یہ بالکل قریب آ چکی ہو۔ نبی کے علاوہ کوئی فرد یا گروہ قطعیت سے اتمام حجت کے واقع ہو جانے کا کبھی بھی اعلان نہیں کر سکتا؟

خود خدا کے انبیاء بھی از خود اتمام حجت کی آخری منزل کے آ جانے کا قطعیت سے کبھی فیصلہ نہیں کر سکے بجز اس کے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس معاملے میں خاص اطلاع دی گئی ہو۔ بلاشبہ انبیاء کی فراست پیغمبرانہ بسا اوقات تحریکِ حق کے مستقبل کے مراحل کو بھانپ لیتی ہے لیکن یہ صرف ایک اندازہ ہوتا ہے اس اندازے پر انبیاء حکم نہیں لگایا کرتے۔ چنانچہ سورۂ جن میں نبی صلعم کی زبان سے کہلوایا گیا:۔

قل انی لا املک لکم ضرا	(اے نبی صلعم) کہہ دیجیے کہ نہ تمہارے لئے
ولا رشدا ۰ قل انی لن	برائی (عذاب) میرے بس میں ہے نہ تمہاری
یجیرنی من اللہ احد	ہدایت۔ کہہ دیجیے کہ اللہ سے مجھے بچانے والا کوئی
ولن اجد من دونہ	اور نہ اس کے سوا کہیں پناہ لینے کی کوئی جگہ ہے۔
ملتحدا ۰ الا بلٰغا	بجز اس کے کہ اللہ کی طرف سے (امانتِ حق) پہنچا دوں
من اللہ ورسلٰتہ	اور اس کے پیغامات سنا دوں، اور جو کوئی اللہ اور
ومن یعص اللہ ورسولہ	اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو اس کے لئے جہنم کی
فان لہ نار جھنم خالدین	آگ (مقدر) ہے جس میں (ایسے لوگ) ہمیشہ رہیں گے۔
فیھا ابدا ۰ حتی اذا	(یہ پیغمبر مجھے سناتے رہنا ہے) یہاں تک کہ جب
راوا ما یوعدون فسیعلمون	اس (انجام) کو دیکھ لیں جس کا انہیں وعدہ دیا گیا
من اضعف ناصرا واقل	اور پھر وہ جلد ہی جان لیں گے کہ (ہم میں سے)
عددا ۰ قل ان ادری ء	کون حمایتیوں کے لحاظ سے کمزور اور تعداد کے لحاظ

قریبٌ ما توعدون ام یجعل له	سے کم ہے۔
ربی امدا عالم الغیب	(اے نبی صلعم) ان سے کہہ دیجئے کہ میں جانتا
فلا یُظہِرُ علیٰ غیبہٖ احداً	ہی نہیں کہ جس (انجام) کا تم کو وعدہ دیا گیا ہے وہ
اِلّا من ارتضیٰ من رسولٍ	قریب ہے یا میرے رب نے اسے کسی لمبی مدت
	کے لئے ملتوی کر دیا ہے۔ وہی "غیب" کا جاننے والا
	ہے اور وہ کسی پر اپنے راز نہیں کھولتا..... مگر
	صرف اُس پر جسے وہ اپنے رسولوں میں سے پسند کرلے!

یہاں دیکھئے، نبی تک یہ کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ اتمام حجت کی منزل قریب آچکی ہے یا دور ہے اور میرے بس میں نہیں ہے کہ تمہارے لئے ہدایت کے دروازے بڑھ کے کھول دوں یا عذاب کے سیلاب کا بند توڑ دوں۔ یہ غیبی حقائق ایسے ہیں کہ ان کے اختیارات کی ساری کنجیاں خود اللہ کے ہاتھوں میں ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں اور اسکو تحدی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ "من یعص اللہ ورسولہ فان لہ نار جہنم خالدین فیہا ابداً" ـــــ یہ ایک اٹل قانون ہے خدا کا اور اس قانون کی صداقت کی گواہی پوری جرأت سے دی جا سکتی ہے۔ پھر یہاں نبی کو اس کے اصل فرض پر متوجہ کیا جاتا ہے کہ تمہارا کام عذاب کے ورود کا انتظار کرنے کے لئے بیٹھ رہنا نہیں، اور تم آنے والے حالات کے لئے تماشائی بن کے نہیں رہ سکتے، تمہارا کام "بلٰغاً من اللہ ورسٰلٰتہٖ" ہے اور اس کام کا حق اگر ادا نہ کر دو گے تو پھر تم کو خدا کی گرفت سے کوئی بچانے والا نہیں اور تم کو اس سے بھاگ کر کہیں پناہ نہ ملے گی۔

نبی کو جب تک خدا کی طرف سے آنے والے فرشتگانِ عذاب براہِ راست آکر یہ اطلاع نہیں دے دیتے کہ اب اتمام حجت کا حق ادا ہو چکا اور آخری فیصلے کی گھڑی آگئی ہے۔ اُس وقت نبی نہ اصلاح کی جدوجہد کو چھوڑتا ہے، نہ قوم سے کنارہ کشی کرتا ہے، نہ تمدن سے بھاگ کر غاروں میں پناہ لینے کی تدابیر اختیار کرتا ہے بلکہ حالات جتنے جتنے تاریک ہوتے جاتے ہیں، وہ اتنا ہی اتنا زیادہ سرگرم ہوتا جاتا ہے ـــ بالکل اس جذبے کے ساتھ جیسے کسی شخص کا بچہ جتنا زیادہ کرب میں مبتلا ہوتا ہے، وہ اس کے دوا اور معالجے کے

لئے اتنے ہی زیادہ اضطراب سے دوڑ دھوپ کرتا ہے، نہ الٹا یہ کہ وہ بیماری کے بڑھ جانے پر الگ جا کے بیٹھ رہے اور بچے کی موت کے وقوع کا انتظار کرنے لگے۔

صرف ایک نبی نے اپنی قوم کو وقت سے ذرا ہی قبل چھوڑ دیا تھا اور عذاب کے آنے میں جو تین دن کی مہلت اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کی گئی تھی اس کے پورا ہونے کا انتظار نہیں کیا تھا۔ یہ یونس علیہ السلام تھے جن پر سخت عتاب ہوا کہ تم نے دعوتِ اصلاح کو ترک کیوں کیا اور وقت سے قبل قوم کو عذاب کا شکار ہونے کے لئے کیوں چھوڑ دیا۔

عذاب کی گھڑی کے سروں پر آ ٹک آنے پر بھی اصلاح کا دروازہ کھلا رہتا ہے، اور یہ نازک موقع مصلحین کے لئے انتہائی سرگرمی کا کام ہوتا ہے کہ وہ آخری مرتبہ اپنی سعی کر دیکھتے ہیں، لیکن عذاب کے وقوع سے قبل اصلاح کی جدوجہد کا ترک کر دینا بہت ہی غلط طریق کار ہے۔ یہ کام تو عین آخری منٹ تک جاری رہنا چاہیئے۔ سورۂ یونس میں ہے کہ:-

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ۝ (۹۸)

کیوں نہ ایسا ہوا کہ کوئی بستی (قوم) — (عذاب کے ٹک آنے پر) — ایمان لے آتی، سو اسکو اس کا ایمان لانا نفع دیتا، مگر صرف ایک قوم یونس نے ایسا کیا ہے، جب وہ لوگ ایمان لے آئے تو ہم نے دنیوی زندگی میں رسوائی کے عذاب کو ان سے ٹال دیا اور ایک مدت کیلئے انکو کام کرنے کی مہلت دیدی!

مراد یہ کہ عذاب کے سر پر ٹک آنے کے بعد بھی مہلت کی آخری گھڑیاں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ کوئی گروہ انسانی رجوع الی اللہ پر آمادہ ہو جائے اور اپنی اصلاح کرے، اور ان گھڑیوں میں مصلحین کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آخری موقع سے فائدہ اٹھانے پر قوم کو زیادہ سرگرمی سے آمادہ کرنے میں لگ جائیں۔ قوم یونس نے یہی کیا کہ جب ان پر عذاب ٹک آیا اور صرف تین دن کی مہلتِ اصلاح باقی رہ گئی تو یونس علیہ السلام حمیتِ حق کے جذبے کے تحت قوم کے سرکش نہ رویے کو دیکھ کر اس سے الگ ہو گئے، لیکن

قوم کو اللہ نے توفیق دی اور اس نے آخری گھڑیوں میں اپنا سر اللہ کے سامنے خم کر دیا اور عذاب ٹل گیا۔

پس عذاب کے در پردے پہلے عذاب کے لازمی مقدر ہو جانے کا فتوے دے دینا اور کسی قوم کی اصلاح سے قطعی طور پر مایوس ہو کر الگ ہونا دعوتِ حق کے کارکنوں کے لئے کبھی بھی جائز نہیں ہے۔

قانونِ عذاب کی ایک مستقل دفعہ اس آیت میں بیان ہوئی ہے کہ:۔

فلولا کان من القرون من قبلکم	پس کیوں نہ ایسا ہوا کہ تم سے پہلے کی اقوام میں سے
اولوا بقیۃ ینھون عن الفساد	وہ لوگ جن میں رحق کا) کچھ اثر باقی تھا (لوگوں کو)
فی الارض الا قلیلا ممن انجینا	زمین میں رقانون الہٰی سے آزاد ہو کر) فساد بپا کرنے
منھم واتبع الذین ظلموا	سے باز رکھتے۔ مگر ایسے لوگ کم تھے کہ جنہیں
ما اترفوا فیہ وکانوا مجرمین ۝	ہم نے رعذاب کا شکار ہونے سے) بچا لیا۔ اور اہل
وما کان ربك لیھلك	ظلم نے وہ روش اختیار کی جس میں عیش دیکھا اور وہی
القری بظلم واھلھا مصلحون ۝	مجرم تھے!
	اور تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ وہ بستیوں (قوموں) کو بے انصافی سے ہلاک کرے۔ بحالیکہ وہاں کے لوگ اصلاح کی جدوجہد میں لگے ہوں:

یہ آیت صاف صاف بیان کر رہی ہے کہ جب تک کسی قوم میں اصلاح کی جدوجہد جاری رہتی ہے کچھ لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں لگے رہتے ہیں، اور ان کی دعوت پر کچھ نہ کچھ لوگ لبیک کہتے رہتے ہیں، کسی نہ کسی حد تک اسے گوارا کیا جاتا رہتا ہے، اور اسے کاملاً رد کر کے ایک قطعی موڑ قوم نہیں مڑ جاتی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب وارد نہیں کیا جاتا۔ اسی قانون کے پیش نظر مطالبہ کیا گیا ہے کہ جن لوگوں میں خدا پرستی کا کوئی اثر موجود ہو، ان کا کام یہ ہے کہ وہ برابر حق سے سرکشی کرنے کی روش سے خواص و عوام کو باز رکھنے میں لگے رہیں۔

یہی بات بنی اسرائیل پر گفتگو کرتے ہوئے دوسری جگہ یوں کہی گئی:۔

ولا ینھٰھم الربانیون والاحبار عن قولھم الاثم واکلھم السحت لبئس ما کانوا یصنعون ۔

کیوں نہ ان کے علماء و صوفیا نے ان کو ان کے مجرمانہ اقوال سے، وان کی حرام خوریوں سے ان کو روکا۔ بہت بری حرکات ہیں جن کو یہ انجام دے رہے تھے۔

یہ سوال جو آخرت میں ہر خدا پرست اور ہر خادمِ دین سے اپنی قوم اور ماحول کے بارے میں ہونے والا ہے۔ اگر اسکو ذہن میں رکھ کر ہمارے متنوع مذہبی حضرات غور کریں کہ کیا اس کا جواب دینے کے لئے وہ پوری تیاری کر چکے ہیں اور صدائے دعوت کا فرض ادا کرکے فارغ ہو چکے ہیں تو شاید ان کو محسوس ہو سکے کہ ابھی کام بہت زیادہ باقی ہے اور انہوں نے اس کا سواں حصہ بھی سر انجام نہیں دیا۔

یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم دوسروں کی اصلاح کے لئے اگر ان لوگوں سے گھل مل کے رہے تو خود ہمیں خطرہ ہے کہ ہم بھی عذاب کی لپیٹ میں نہ آجائیں۔ اس وجہ سے ہمیں تمدن سے الگ ہو کے کہیں جنگلوں میں اپنی جانیں بچانے کی فکر کرنی چاہیے۔ حالانکہ ان کو قانونِ عذاب کی اس دفعہ کا علم نہیں جس کی رُو سے اللہ تعالیٰ نے اس بات کی ضمانت دی ہے کہ مصلحین اگر حقِ اصلاح ادا کر رہے ہوں اور اس حال میں عذاب آجائے تو ان کو بچا لیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

حقاً علینا ننجی المؤمنین

ہم پر حق ہے کہ ہم اہل ایمان کو عذاب سے بچا لیں۔

پوری تاریخ اقامتِ دین کو دیکھئے، ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ مصلحین کو مجرمین کے انجام سے بچا لیا گیا ہے۔ اللہ مصلحین اور فاسقین میں فرق کرتا ہے اور دونوں سے اس کا سلوک مختلف ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

افمن کان مؤمناً کمن کان فاسقاً ؟

بھلا وہ جو مومن ہو، اس کے برابر ہو سکتا ہے جو فاسق ہے؟ (تفہیم)

ہمارے ان متنوع مصلحین کو یہ بات بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ حالات کو عین اس وقت پلٹ دیتا ہے جب کہ وہ بظاہر انتہائی بگاڑ کو پہنچ جاتے ہیں۔ رات کی تیرگی جب گہری ہو چکتی ہے تو اس

کا سینہ پھاڑ کر اُس سے صبح برآمد ہو جاتی ہے خشک سالی جب اپنی انتہا کو پہنچ چکتی ہے تو بارانِ رحمت کا نزول ہوتا ہے، اسی طرح قوموں کا بگاڑ بڑھتے بڑھتے جب ایک خاص حد کو پہنچتا ہے تو اصلاح اس میں سے اپنا راستہ نکال لیتی ہے۔ یہی حقیقت ہے جسے یوں بیان کیا گیا:۔

هو الذی ینزل الغیث من بعد
ما قنطوا وینشر رحمته

وہ (اللہ) وہ ہے جو لوگوں کے مایوس ہو جانے
پر بادل بھیج دیتا ہے اور پھر اپنی رحمت (کی بارش)
کو (ہر طرف) بکھیرتا ہے۔

دوسرے مقام پر وحی ونبوت کی بارانِ رحمت کے نزول اور بگاڑ کے بعد ایک قوم کی اصلاح کے سامان کے اچانک ظہور کا منظر یوں بیان کیا گیا ہے:۔

وهو الذی یرسل الریح بشرا
بین یدی رحمته حتی اذا
اقلت سحابا ثقالا سقنٰه لبلد
میت فانزلنا به الماء فاخرجنا
به من کل الثمرات کذلک
نخرج الموتی لعلکم تذکرون
۔۔۔ والبلد الطیب یخرج
نباته باذن ربه والذی
خبث لا یخرج الا نکدا

اور وہی ہے جو اپنی رحمت کے آگے (پیش آہنگ) کی
بشارت دینے والی ہواؤں کو بھیجتا ہے۔ یہاں
تک کہ وہ ابرِ کثیف کو لاد کے لے چلتی ہیں، پھر ہم
ہانک کے لے گئے ان کو کسی زندگی باختہ شہر تک،
پھر ان میں سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے ہر
قسم کے پھل اگائے۔ یوں ہم مردوں کو زندہ کر کے
نکال کھڑا کرتے ہیں۔ شاید کہ تم (اس استعارے سے)
بات پا جاؤ!

اور (ہماری بارانِ رحمت کے نزول پر) پاکیزہ بستی
(پاکیزہ) برگ وبار لاتی ہے اپنے رب کے اشارے
سے، اور (دوسری طرف) جو بستی خبیث ہوتی ہے
اس میں پیداوار ناقص ہی ہوتی ہے!

یہ پورا ٹکڑہ معنی خیز استعارے پر مشتمل ہے اور جا بجا اس میں وہ اشارے موجود ہیں جو بتاتے ہیں کہ بات عام

بارش کی نہیں، بلکہ انسانی زندگی پر بارانِ وحی و ہدایت کے واقع ہونے پر گفتگو کی جا رہی ہے۔ یہاں پر واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ بستی یا قوم جس کے افراد ذہنی و اخلاقی موت کا شکار ہو چکے ہوں اور جن میں بظاہر زندگی کے کوئی آثار باقی نہ رہے ہوں، ان کو بھی ہم از سرِ نو زندگی عطا کر دکھاتے ہیں۔ یہاں بلا شبہ ایک اشارہ معادؔ کے بعث موتیٰ کی طرف بھی ہے، لیکن اس سے زیادہ استدلال دنیا میں مشکل ترین حالات میں احیائے دین کی کوششوں کو بار آور کر دکھانے پر کیا گیا ہے۔ کون جانتا ہے کہ کس وقت کس بستی اور کسی قوم کے لئے بشارت کی ہوائیں چلنے لگیں اور کب بارانِ رحمت کا نزول ہو جائے! بشارت کی ہواؤں کے چلنے اور بارانِ رحمت کے نزول میں کسی بستی اور قوم کی کھیتی کا ویران ہونا حائل نہیں، بلکہ اکثر یہ رحمت الٰہی کے لئے بلاوا ہوتا ہے۔

علاوہ بریں قرآنِ کریم نے انتہائے معصیت و بغاوت کو پہنچے ہوئے افراد اور جماعتوں تک کو اطمینان دلایا ہے کہ جب بھی تم اصلاح پر آمادہ ہو گئے، توبہ کے دروازوں کو کھلا پاؤ گے:۔

قل یٰعبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً انہ ھو الغفور الرحیم!

(اے نبی صلعم!) کہ دیجئے کہ اے میرے بندو! ۔۔۔ وہ کہ جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیے ہیں ۔۔۔ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ! اگر تم آمادہ اصلاح ہو جاؤ تو بلا شبہ اللہ تمہارے سارے کے سارے گناہ بخش دیگا۔ یقیناً وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اب اللہ تو اپنے بندوں کے لئے مغفرت و اصلاح کے دروازے چوپٹ کھولے ہوئے ہے، چاہے بظاہر ان کے حالات کیسے ہی مایوس کن ہوں، لیکن ہمارے قنوطی حضرات کو نہ معلوم کیسے یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ ان دروازوں کو بند سمجھیں یا یہ یقین کر لیں کہ ان دروازوں سے اب کوئی داخل ہونے والا نہیں رہا۔ آخر اس بات کے لئے ذریعۂ معلومات کیا ہے کہ کب کس کے دل میں انابت الی اللہ کی لہر اُٹھے اور کب کون اپنے سابق گناہوں پر نادم ہو کر اطاعتِ الٰہی کے لئے کمر بستہ ہو جائے؟ ۔۔۔ محض ایک سرسری اندازے پر تو کسی قوم کے قطعی طور پر مستحقِ عذاب ہو جانے کا فیصلہ نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ایک افسوسناک زیادتی ہے!

آپ کا مایوس ہو کر غاروں میں بیٹھ رہنا، شخصی زندگی کی سرگرمیوں میں کھو جانا اور اصلاحِ ملت سے ہاتھ

اٹھالینا اللہ کو اس سے روک نہیں سکتا کہ وہ ہدایت کے دروازے چوپٹ کھول دے۔ وہ "خالق الاصباح" اگر رات کا سینہ چیر کر اس میں سے نیا دن ابھار کے لا دکھائے تو کسی کی قنوطیت مانع نہیں ہوسکتی، پس کرنے کا کام قنوطیت کا اظہار نہیں، بلکہ امید کے اسباب کا ابھارنا ہے۔ اسے کیجئے اور بددلی پھیلا کر ان لوگوں کے کام میں روڑے نہ اٹکائیے جو بساط بھر ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔

آپ نے عوام کی اصلاح سے مایوسی کا فتویٰ دینے سے پہلے کاش کہ اتنا غور کیا ہوتا کہ اب تک آخر اصلاح کا کام ہوا کیا ہے؟ —— کیا یہ چند وعظ، چند تقریریں، چند درس اس بات کے لئے کافی ہیں شہادتِ حق اتمام حجت کی منزل کو پہنچ جائے! یہ وعظ اور درس اتنی بڑی قوم کی اصلاح کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتے یہ قوم جس کو چاروں طرف سے شیاطین نے گھیر رکھا ہے۔ یہ جس کو "ائمہ ضلالت" یوں طرح گھیرے ہوئے ہیں جس کی صحافت الحاد و لادینی کا طوفان اٹھا رہی ہے۔ جس کے علماء نے تو دین کی حقیقت کو اُن پر مشتبہ بنا رکھا ہے، جس کے لیڈروں نے مختلف بولیاں بول بول کر اسے ایک انتشار میں مبتلا کر رکھا ہے، جس پر سرمایہ اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہے، جس پر جدید فلسفے کا طوفان لٹریچر کی صورت میں ٹوٹا پڑتا ہے، اس میں آپ کے چند وعظ کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں تو مساعیٔ اصلاح میں اگر عمریں کھپ جائیں تو بھی نہیں کہا جا سکتا کہ شہادتِ حق کا حق ادا ہوگیا!

کسی داعیٔ حق کو اُس وقت تک مایوسی کا اظہار کرنے کا حق نہیں جب تک ایک ماحول میں اس کا وجود کسی درجے میں بھی گوارا کیا جاتا ہے، اور جب تک بچہ بچہ اسکی دعوت کو علانیہ رو در رو ہو کر ٹھکرا نہیں دیتا۔ بخلاف اس کے یہاں تو حالات انتہائی امید افزا ہیں۔ لوگ آپ کی بات سنتے ہیں، بعض اثر لیتے ہیں، بعض قبول کرتے ہیں، بعض عملی تعاون پر تیار ہو جاتے ہیں، بعض، دینِ حق کے لئے ہمہ تن ایثار بن جاتے ہیں —— آہستہ آہستہ کوشش کرنے والوں کی کوششوں کے نتائج برابر نکل رہے ہیں! بحالیکہ حال یہ کہ لوگ مکہ میں خدا کا نام نہیں لے سکتے تھے، پٹتے تھے، لہولہان کر دیئے جاتے تھے، دو سال تک شعب ابی طالب میں نظر بند رکھے گئے، جب بھی انہوں نے اُس وقت سے پہلے قنوطیت کے جذبوں کو دلوں میں جگہ نہ دی، جب تک کہ ان کے قتل اور اخراج کے منصوبے نہ بن گئے اور جب تک کہ ان کو یہ یقین نہ ہوگیا

کہ اب مکّہ کی سرزمین ان کا وجود ایک لمحے کے لیئے بھی گوارا نہیں کر سکتی! لیکن ہزار طرح کی سہولتوں اور آسانیوں میں ہوتے ہوئے آپ کون ہوتے ہیں کہ قوم کی اصلاح کے ناممکن ہونے کا فتوے دیں؟ آپ کی قنوطیت ایک خطرناک بزدلی اور فرض ناشناسی کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے، براہِ کرم اس کے علاج کی طرف توجہ فرمایئے، ورنہ بحالاتِ موجودہ دوسروں کی طرف سے جو تھوڑی بہت سعیِ اصلاح ہو رہی ہے، آپ اسکی راہ میں بھی رکاٹیں ڈالتے رہیں گے۔

یہ ساری قنوطیت خدا تعالےٰ کے سنن و قوانین کو نہ جاننے کی وجہ سے ہے۔ اللہ آپ کو توفیق دے کہ ان سنن و قوانین کو آپ سمجھیں اور حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کو ملحوظ رکھیں۔

یہ تمام قنوطیت زدہ عناصر جن کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کے مرض کے اسباب چاہے کتنے ہی مختلف ہوں، نتیجہ بہرحال ایک ہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ قنوطیت سے متاثر ہونے والے ہزاروں افراد عضو معطل بن کے رہ گئے ہیں اور عین اس حال میں کہ خیر و شر کی فیصلہ کن کشمکش ہو رہی ہے، یہ اپنی قوتیں اس کشمکش میں لگانے سے رُکے بیٹھے ہیں۔ پھر اگر خود یہ حضرات ہی ناکارہ بن کے بیٹھ رہتے تو غنیمت ہوتا، مشکل یہ ہے کہ یہ اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر میں اپنے اقوال سے بھی اور طرزِ عمل سے برابر دوسروں کو بھی اپنے ہی مرض میں مبتلا کر رہے ہیں۔ یہ لوگ حق کو حق ماننے کے باوجود اور اس کے غلبے کے حریص ہونے کے باوجود اس کی ترقی میں حائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی اصلاح کے لیئے بے چین ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح ان کے بجھے ہوئے دیئے پھر سے روشن کیئے جا سکیں۔ (باقی آئندہ)

پیغمبرانہ دعوتِ انقلاب

اور اس کے

اصول و مبادی

(حکیم حیدر زماں صدیقی)

یہ مقالہ حکیم صاحب کی ایک زیرِ ترتیب کتاب کا پہلا باب ہے۔ حکیم صاحب مسائل زندگی پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے غور کرتے ہیں اور آپ کا قلم اسلامی نظام حیات کی قدروں کو فروغ دینے کے لئے پوری طرح سرگرم کار ہے۔ اس سے پہلے مختلف جرائد میں آپ کے بعض اچھے تحقیقی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مقالہ جسے ہم پیش کر رہے ہیں، پاکستان کے اس دور میں جب کہ یہ ملک اسلامی انقلاب کے مرحلوں سے گذر رہا ہے، ایک خاص قدر و قیمت کا حامل ہے۔ (ادارہ)

فن سرجری کا ماہر ڈاکٹر جب جسم کے ناسور کا اپریشن کرتا ہے تو اس کی تمام تر توجہ دو باتوں میں سمٹ جاتی ہے۔ ایک یہ کہ جسم کا کوئی صالح اور صحت مند حصہ اس کے عمل جراحی کی زد میں نہ آ جائے، اور دوسرے یہ کہ متعفن اور سمیت آلود مادہ کا کوئی ذرہ جسم کے اندر باقی نہ رہ جائے جس کے جراثیمی تعدیہ سے جسم کے دوسرے حصے متاثر ہو جائیں۔ جو ڈاکٹر ان دو باتوں یا ان میں سے کسی ایک سے بے اعتنائی کرتا ہے وہ مریض کو اس ہلاکت آفریں مرض کے چنگل سے بچانے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کو مریض معاشرۂ انسانی کے علاج کے لئے خدا کی طرف سے بھیجا جاتا ہے اور ان کی دوررس نگاہ پہلے مرحلہ پر ہی معاشرہ کے تمام فکری، ذہنی، روحانی اور عملی اسقام و مفاسد کا جائزہ لیتی ہے، مثلاً سب سے پہلے وہ تمام خارجی مفاسد کے اصل سرچشمہ یعنی لادینی رجحان فکر کی کھوج لگاتے ہیں جس سے تمام عملی مفاسد پھوٹ پھوٹ کر نکلتے ہیں اور اس کے بعد معاشرہ کے خارجی احوال و شئون کی طرف توجہ کرتے ہیں اس کی معیشت و معاشرت اور سیاست و اجتماع کے طرز و طریق میں جہاں جہاں ان کو خرابی نظر آتی ہے اس کو

چن چن کر سامنے لاتے ہیں اور اس کی اصلاح و تبدیلی میں پوری قوت صرف کرتے ہیں اور پہلے سے جو اچھی چیزیں اس میں موجود ہوتی ہیں ان کو جوں کا توں باقی رکھا جاتا ہے۔ پیغمبرانہ دعوتِ انقلاب کے اس اصولی طریقِ کار سے ایک صالح، صحت مند، مہذب اور مثالی معاشرۂ انسانی معرضِ وجود میں آتا ہے۔

تنظیمِ جماعت پہلے مرحلہ پر نبی کا کام انسانی قلوب کو وساوس و اوہام اور شکوک و شبہات سے پاک کر کے ان کو ایک مقدس تر اور واضح تر اخلاقی مقصدِ حیات سے متعارف کرنا اور بہ تدریج ان کے رجحانِ فکر اور شعورِ ذہنی میں تبدیلی پیدا کرنا ہے، جو لوگ اس نئی انقلابی جماعت کے رکن بنتے ہیں ان کو پہلے ہی دن یہ بتادیا جاتا ہے کہ ابھی سے تمہیں زندگی کا نقطۂ نظر بدلنا ہوگا، فکر و ذہن میں تبدیلی پیدا کرنی ہوگی اور اس جدید تصورِ زندگی کے مطابق اپنی سیرت کو ڈھالنا ہوگا۔ اس آئینی معاہدہ (بیعت) سے وہ جماعتِ مسلمہ کی رکنیت اختیار کرتے ہیں اور اس طرح چند پاکیزہ، نیک سیرت اور بالغ النظر انسانوں کی ایک مختصر سی جماعت تیار ہو جاتی ہے جو اپنے اعلیٰ کردار اور حسنِ عمل کی کشش سے بڑے بڑے مغرور اور متکبر انسانوں کو اپنی طرف کھینچ لاتی ہے۔

تطہیرِ فکر اور تعمیرِ فکر کے اس دوگونہ اسوۂ نبوت کو قرآن حکیم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

كما ارسلنا فيكم رسولاً منكم يتلو عليكم آياتنا ويزكيكم ويعلمكم الكتاب والحكمة ويعلمكم ما لم تكونوا تعلمون (البقرہ)

جیسا کہ ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، تمہارے دلوں کا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم اس سے پہلے نہیں جانتے تھے۔

یعنی تزکیۂ نفس اور تطہیرِ فکر کے بعد الکتاب والحکمۃ وہ تعمیری لائحہ عمل ہے جس سے فکر و عمل اور سیرت و کردار کی تعمیر ہوتی ہے۔

اخلاصِ مقصد اور تخلیقِ یقین خود نبی کو اپنے مقصدِ حیات سے نہایت گہری عقیدت ہوتی ہے نیز اسکو اس بات میں غیر متزلزل یقین ہوتا ہے کہ حیاتِ انسانی کے تمام مسائل صرف اسی نظریۂ زندگی کے توسط سے حل ہو سکتے ہیں جو خدا کی طرف سے اسکو ملا ہے، اس لئے وہ پورے عزم و ایمان کے ساتھ لوگوں کے سامنے

اس کا اعلان کرتا ہے، مصائب و آلام کی آندھیاں آتی ہیں، رنج و بلا کے طوفان اٹھتے ہیں، کہیں قتل کی دھمکیاں دی جاتی ہیں اور کہیں جلاوطنی کے منصوبے ہوتے ہیں قوم کا بچہ بچہ جانی دشمن بن جاتا ہے، گالیوں اور طعنوں کی ہر طرف سے بوچھاڑ ہو رہی ہوتی ہے مگر نبی کے عزم و ارادہ کا یہ حال ہے کہ وہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر کھڑا ہے۔

ولقد كذبت رسل من قبلك فصبروا على ما كذبوا واوذوا حتّٰى اتٰهم نصرنا ولا مبدل لكلمٰت الله ولقد جاءك من نبأ المرسلين (الانعام)

آپ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا، پس انہوں نے جھٹلائے جانے اور اذیت دیئے جانے پر صبر کیا یہاں تک کہ ان کو ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کے فیصلوں کو کوئی تبدیل کرنے والا نہیں ہے۔ اور بلاشبہ رسولوں کے واقعات آپ تک پہنچ چکے ہیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کے ایمان و یقین کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کی مسلسل ایذارسانی پیہم تکذیب و تضحیک اور اپنی تنہائی و بے سروسامانی کے باوجود ان الفاظ میں اپنے عزم و یقین کا اعلان کرتے ہیں۔

يٰقوم ان كان كبر عليكم مقامي وتذكيري باٰيٰت الله فاجمعوا امركم وشركاءكم ثم لا يكن امركم عليكم غمة ثم اقضوا الي ولا تنظرون۔ (سورہ یونس)

اے میری قوم! اگر میرا منصب اور میرا تم کو نصیحت کرنا اللہ کی آیات سے تم پر گراں گذرتا ہے تو میں صرف اللہ پر بھروسا کرتا ہوں پس تم اپنے معبودوں کو ساتھ لے کر اپنے معاملہ کو ٹھیک کر لو، تمہارا معاملہ تم پر مشتبہ نہ ہے پھر تم میرا فیصلہ کر دو اور مجھے مہلت نہ دو۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی تیرہ سالہ مکی زندگی میں قریش کے ہاتھوں جو مظالم سہے ان کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، دنیا میں ایک کون ہوگا جس نے اتنی طویل مدت تک ایسے کینہ پرور دشمنوں میں رہ کر مسلسل جگر خراش آلام و مصائب برداشت کیئے ہوں۔ مگر ایک لمحہ کے لئے بھی

اس کا دامن صبر ہاتھ سے نہ چھوٹا ہو، اتنا ظلم و تشدد کہ خود خداوند تعالیٰ آپ کے مصائب کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں۔

لولا ان ثبتناك لقد كدت تركن	اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو آپ کچھ
اليهم شيئاً قليلاً۔	نہ کچھ ضرور ہی ان کی جانب جھک جاتے

حق یہ ہے کہ یہ عشق و مستی کا وہ مقام ہے جہاں جسمانی اذیتوں اور حوصلہ شکن مصائب کا بطیب خاطر استقبال کیا جاتا ہے۔

عشق بازی را تحمل بایدلے دل عشق باز   گر بلاتے بود بود و گر خطاتے رفت رفت

آپ جس سرزمین میں رہتے ہیں وہاں ہر طرف سے آپ کی دعوت میں روکاوٹیں پیدا کی جاتی ہیں، آپ سے اور آپ کے پیروؤں سے یہ کہکر مذاق اڑایا جاتا ہے کہ دیکھو ان کا حال کیا ہے کہ کھانے کو روٹی میسر نہیں ہے اور پہننے کو کپڑا نہیں ہے اور ان کی باتیں سنو تو روئے زمین کی حکومت خلافت کے خواب دیکھ رہے ہیں غرض قدم قدم پر روح فرسا اور ہمت شکن حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے مگر دشتِ بلا کی ہر ٹھوکر سے ان کے عزم و ایمان میں پختگی اور قدم ہمت میں ثبات و استقلال پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔

وادیٔ عشق اگر دور و دراز ست ولے   طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

نبی کا سینہ ابتدا ہی سے نور و ایمان سے منور ہوتا ہے لیکن اہل زمانہ کے عمل و کردار کی ظلمت جس قدر تیز اور گہری ہوتی چلی جاتی ہے اسی قدر اسکی نگاہ حقیقت شناس نمودِ صبح کی جلوہ پاشیوں کو قریب تر دیکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسکو تحمل شدائد سے دکھ نہیں ہوتا بلکہ لذت محسوس ہوتی ہے۔

ان الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا	بے شک جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار
تتنزل عليهم الملائكة ان لا تخافوا	صرف اللہ ہی ہے اور پھر اس قول پر مضبوطی
ولا تحزنوا وابشروا بالجنة	سے ڈٹ گئے ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں
التي كنتم توعدون۔ نحن اولياؤكم	(جو ان کو یہ کہتے ہیں کہ) ڈرو نہیں اور نہ غم

فی الحیٰوۃ الدنیا وفی الاخرۃ ولکم — کھاؤ اور جس جنت کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے اس

فیہا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا — پر خوشی مناؤ۔ ہم دنیا اور آخرت میں تمہارے

ما تدعون نزلاً من غفور رحیم — مددگار ہیں اور تمہارے لئے جنت میں وہ سب

کچھ ہے جس کی تم خواہش رکھتے ہیں اور جو کچھ تم مانگتے ہو، یہ بخشنے والے، اللہ رحم کرنے والے خدا کی طرف سے مہمانی ہے۔

حضرت خبابؓ جناب رسالت مآب صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر رنج و آلام کا شکوہ اور آپ سے دعا کی درخواست کرتے ہیں، آپ ان ستم رسیدہ اور مظلوم انسانوں کو یوں خطاب کرتے ہیں:۔

قال کان الرجل فی من کان قبلکم یحفر — تم سے پہلے ایسے لوگ ہو گذرے ہیں کہ زمین

له الارض فیجعل فیه فیجاء بالمنشار — میں گڑھا کھود کر ان کو اس گڑھے میں لٹایا جاتا

فیوضع علی رأسه فینشق وما یصده — اور پھر ان کے سر پر آرا رکھ کر ان کو چیر دیا جاتا

ذالک عن دینه ویمشط بامشاط الحدید — تھا لیکن یہ آزمائش ان کو دین سے نہ پھیر سکتی تھی

ما دون لحمه من عظیم وعصب وما — ان کے جسم میں لوہے کی کنگھی کے دندانے اس طرح

یصده ذالک عن دینه واللہ لیتمن — کھبوتے جاتے کہ وہ گوشت سے نیچے انکی ہڈی

ھذا الامر حتی یسیر الراکب من صنعاء — اور پٹھوں کو چھلنی کر دیتے تھے لیکن یہ مصیبت

الی حضرموت لا یخاف الا اللہ و — بھی ان کو راہ حق سے نہ پھیر سکتی تھی۔

ولکنکم تستعجلون۔ (اخرجه البخاری) — خدا کی قسم یہ امر (اسلام) مکمل ہو کر رہیگا

اور (اس طرح ہمہ گیر امن قائم ہوگا) کہ سوار صنعاء سے حضر موت تک چلا جائیگا اور اسکو اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا لیکن تم بہت جلدی کرتے ہو۔

یہ تو خود انبیا علیہم السلام کا حال ہے لیکن جو لوگ سچے دل سے حضرات انبیاءؑ پر ایمان لاتے ہیں ان کو بھی کچھ ایسا ہی ذوق یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مقصدِ حیات کی راہ میں پیش آنے والی بڑی سے بڑی آزمائش کو خوش آمدید کہتے ہیں، کلمۂ حق کے اعلان و اظہار میں اتنے بے باک ہوتے ہیں کہ دنیا کے بڑے مغرور

ومتکبر انسان ان کی نگاہ میں نہیں جچتے اور وہ بے خوف وخطر ان کے پرہیبت درباروں میں گھس جاتے ہیں اور ان کی نگاہِ ایمانی سے ان ظالم وجابر حکمرانوں کے پرشکوہ تخت وسریر لرز اٹھتے ہیں۔

باسلاطیں درفتد مردِ فقیر از شکوہ بوریا لرزد سریر

ان کی ضربِ لاالٰہ سے بتانِ باطل ریزہ ریزہ اور ان کے ہاتھوں سے اربابِ اقتدار کی قباء کہنہ چاک چاک ہو جاتی ہے۔

ریزہ ریزہ از ضربِ اُو لات ومنات در جہات آزاد از بندِ جہات

ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ اُو قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ اُو

مصر کا مغرور اور متکبر بادشاہ اپنے تمام لاؤ لشکر کے ساتھ کھڑا ہے۔ اسکی ہیبت وشوکت سے لوگوں کے دل لرز رہے ہیں۔ نظریں سہمی ہوئی ہیں۔ رگوں میں خون خشک ہو رہا ہے اور کسی کو اس کے سامنے لب کشائی کی جرأت نہیں ہے۔ اس حالت میں اسکی نگاہِ غرور اٹھتی ہے اور وہ اپنی قوم کو یوں خطاب کرتا ہے۔

وقال فرعون ذرونی اقتل موسیٰ فرعون نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو۔ میں موسیٰ کو قتل

ولیدع ربہ انی اخاف ان یبدل کر دوں، اور وہ اپنے رب کو پکارے۔ مجھے

دینکم او ان یظہر فی الارض الفساد ڈر ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل دے گا یا

زمین میں فساد کھڑا کرے گا۔

اس اجتماع میں فرعون ہی کی قوم کا ایک خداشناس انسان بھی موجود تھا جو اگرچہ پہلے سے نورِ ایمان سے منور ہو چکا تھا مگر اس سے پہلے اس نے اپنے ایمان کو ظاہر نہ کیا تھا۔ فرعون کے ان پرغرور الفاظ سنکر وہ ضبطِ سخن نہ کر سکا۔ اب اس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ جس نظریۂ زندگی کو صحیح سمجھتا ہے اسکو دل ہی میں چھپائے رکھے اور زبان سے اس کا اظہار واعلان نہ کرے۔ یہ وقت بڑا ہی نازک تھا فرعون کی ایک ہی جنبش زبان سے اس کا سر قلم کیئے جانے کا خطرہ تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس وقت حضرت موسیٰ کا ساتھ دینا فرشتۂ موت کو دعوت دینا ہے۔ مگر اس کی خلشِ ایمانی سنئے اسکو کچھ اس طرح

بے قرار و مضطرب کر دیا کہ فرعون کی حشمت و جاہ اور جلال و شکوہ اسکو مرعوب نہ کر سکا چنانچہ یہ مرد مومن اس موقعہ پر کھڑے ہو کر فرعون اور اسکی قوم کو خطاب کرتا ہے۔

أتقتلون رجلا أن يقول ربي الله وقد جاءكم بالبينات من ربكم وإن يك كاذبا فعليه كذبه وإن يك صادقا يصبكم بعض الذي يعدكم إن الله لا يهدي من هو مسرف مرتاب (المومن)

کیا تم ایسے آدمی کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا پروردگار صرف اللہ ہے اور وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلائل و براہین لے کر آیا ہے۔ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال اسی پر پڑے گا اور اگر سچا ہے تو تم پر اس عذاب الٰہی کا کچھ حصہ ضرور ہی آ پڑے گا جس کا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے بے شک اللہ تعالیٰ اس شخص کو ہدایت نہیں کرتا جو حد سے بڑھنے والا اور ریب و شک میں مبتلا ہو۔

اس مرد مومن کو اپنے عقیدہ و مسلک کی صداقت پر اتنا بھروسا ہے کہ وہ حیرت انگیز عزم و یقین کے ساتھ قوم کو اپنے مسلک کی دعوت دیتا ہے۔

يٰقوم اتبعون أهدكم سبيل الرشاد

اے میری قوم تم میرے پیچھے چلو۔ میں تم کو ہدایت کی راہ دکھاتا ہوں۔

اور اس قوم کے انجام کے متعلق بھی وہ کس درجہ محکم اور غیر متزلزل یقین رکھتا ہے۔

فستذكرون ما أقول لكم وأفوض أمري إلى الله إن الله بصير بالعباد (المومن)

تم بہت جلد اس بات کو یاد کرو گے جو میں تم سے کہتا ہوں۔ اور میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں بیشک اللہ تعالیٰ بندوں کے حالات کو دیکھنے والا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ حضرات انبیاء جن لوگوں کے ذریعہ انقلاب بپا کرتے ہیں وہ سب کے سب چشمۂ نبوت سے فیضیاب ہوتے ہیں اور ان کو مقصد سے اس قدر گہری عقیدت ہوتی ہے کہ اس کے لئے جان و مال اور اولاد کی

قربانی ان کی نظر میں ہر بات سے آسان تر ہوتی ہے۔

تمنت سلمی ان نموت بحبها واهون شیء عندنا ما تمنت

تربیتِ فکر و عمل | اخلاصِ مقصد اور تقویتِ یقین کے لئے یہ ضروری ہے کہ افرادِ جماعت کو کچھ ایسے احکام و فرائض کی پابندی کا عادی بنایا جائے جن سے ان کا ذوقِ یقین بڑھے۔ ان کی عملی صلاحیتوں کو فروغ حاصل ہو، جذبۂ منفعتِ ذات کمزور اور اجتماعی و ملی احساس تیز تر ہوتا جائے۔ طبیعتوں میں ضبط و نظم اور سیرت و کردار میں پاکیزگی پیدا ہوتی جائے۔

ان مقاصد کی تکمیل کیلئے خدائے قدوس کی طرف سے کچھ عبادات کی پابندی عائد کی جاتی ہے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج بظاہر چند مذہبی رسوم ہیں جن کا انسان کی اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو یہ فکر و عمل کی تربیت کے لئے ایک مکمل نصاب ہے۔ اسلام میں دوسرے مذاہب کی طرح عبادت محض رسوم و آداب کا نام نہیں ہے کہ مندر یا گرجے میں پہنچکر آپ چند مقررہ رسمیں ادا کرنے کے بعد یہ سمجھ لیں کہ بس اب ہمارا آقا یا خدا ہم سے خوش ہو جائے گا اور اب زندگی کے دوسرے معاملات میں ہماری اپنی مرضی کام کرے گی یعنی اب ہم خدا کی مملکت سے نکل کر انسانی مملکت میں آگئے ہیں اور یہاں خدا کی مرضی کی رعایت رکھنا ضروری نہیں رہا۔

دراصل اسلامی عبادت زندگی کے اجتماعی نظام کا ایک حصہ ہے اور اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی زندگی کے معاملات سے الگ نہیں کیا جا سکتا چنانچہ قرآن حکیم نے مطلق عبادت اور خاص خاص عبادات کا جہاں جہاں ذکر کیا ہے، ان کے مصالح و حکم بھی ساتھ ہی بیان کر دیئے ہیں، جیسا کہ عام عبادت کی نسبت قرآن کریم نے واضح طور پر کہدیا ہے۔

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق فاعبد اللہ مخلصا له الدین الا للہ الدین الخالص (زمر)

ہم نے فی الواقع آپ کی طرف کتاب اتاری ہے۔ پس آپ اللہ کی عبادت کریں اپنے دین کو اسی کے لئے خالص کر کے۔ یاد رکھو کہ دین خالص اللہ ہی کیلئے ہے۔

قل انی امرت ان اعبد اللہ مخلصا

اے نبی آپ کہدیں کہ مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں

لہ الدین۔ (زمر) اللہ کی عبادت کرو۔ دین کو اس کے لئے خالص کر کے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ اسلام میں عبادت، نظام اطاعت کا ایک حصہ ہے، وہ جماعت مسلمہ کے ہر رکن سے اسلام یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ عبادت اور اطاعت کو ایک ہی ذات کے لئے مخصوص کر دے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ عبادت تو اللہ کیلئے ہو اور زندگی کے دوسرے معاملات میں ہوائے نفس یا غیر الٰہی قانون کی اطاعت کی جائے یعنی اسلام آپ کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ آپ اپنی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں ایک حصہ تو خدا کے لئے ہو اور دوسرا شیطان کے لئے! بلکہ اسلام آپ سے یہ چاہتا ہے کہ آپ کی پوری زندگی خدا کی مرضی کے مطابق بسر ہو۔

یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطان (آیہ) اے ایمان والو تم داخل ہو جاؤ اسلام میں مکمل طور پر اور شیطان کے نقوشِ قدم کا اتباع مت کرو

ایک دوسری جگہ عبادت کا یہ مقصد بیان کیا گیا ہے :۔

فاعبد ربک حتی یاتیک الیقین (الحجر) پس آپ عبادت کریں اپنے رب کی یہاں تک کہ آپکو یقین کا اعلیٰ مقام حاصل ہو جائے۔

اسی طرح خاص خاص عبادات کو قرآن حکیم بار بار ذکر کرتا ہے اور ہر مرتبہ ان کی کسی خاص حکمت و مصلحت کو بھی بالوضاحت بیان کرتا ہے۔ مثلاً نماز کے متعلق ایک جگہ ارشاد ہوا ہے

واقم الصلوٰۃ ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر۔ (العنکبوت) اور آپ نماز قائم کریں۔ بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے باز رکھتی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کو شخصی اور اجتماعی سیرت کی اصلاح و تعمیر میں خاص دخل ہے۔ اور جو نماز انسان کے اخلاق کو بلند کرنے اور سیرت و کردار کی اصلاح و تعمیر سے قاصر رہے وہ حقیقت میں نماز ہی نہیں ہے۔

تسویۂ صفوف کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :۔

لتسون صفوفکم او لیخالفن اللہ بین وجوھکم (اخرجہ الترمذی)

تم اپنی صفیں سیدھی کروگے ورنہ اللہ تعالٰے تم میں اختلاف پیدا کر دے گا۔

قرآن کریم میں روزے کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

یا ایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون (بقرہ)

اے اہل ایمان! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسے کہ ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں تاکہ تم صاحب تقوٰے بن جاؤ۔

"تقوٰی" کی اصطلاح قرآن حکیم میں ہر جگہ اور ہر موقعہ پر استعمال ہوئی ہے اور اس کا مفہوم اتنا جامع اور اتنا وسیع ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ اسی سے بلند سیرت اور پاکیزہ اخلاق کی تشکیل ہوتی ہے، اسی سے سیاستِ عادلہ اور معیشتِ صالحہ عالم وجود میں آتی ہے اور اسی سے ایک مہذب تمدن اور صحت مند معاشرہ تیار ہوتا ہے:۔

یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وقولوا قولاً سدیداً یصلح لکم اعمالکم (سورۃ احزاب)

اے اہل ایمان! تم اللہ سے ڈرو اور ٹھیک ٹھیک بات کہو۔ اللہ تمہارے اعمال کو درست کر دیگا۔

بلکہ اگر تعمق نظر سے دیکھا جائے تو تقوٰی ہی وہ حقیقی طاقت ہے جو انسان کو شرفِ انسانی کی بنیادوں پر کھڑا کرتی ہے۔ اس کے اعمال میں اعتدال و توازن قائم رکھتی ہے اور اسکو حقیقی غلبہ و اقتدار عطا کرتی ہے

یا ایھا الذین آمنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقاناً ویکفر عنکم سیئاتکم (الانفال)

اے ایمان والو اگر تم اللہ سے ڈروگے تو اللہ تعالٰے تمہارے لئے فرقان (حق اور باطل میں فرق کرنے والی قوت) پیدا کر دے گا اور تمہاری برائیوں کو تم سے مٹا دے گا۔

زکوٰۃ کی اجتماعی اور ملی حیثیت بالکل ظاہر ہے، چنانچہ قرآن حکیم نے اسکو ایک اجتماعی فریضہ

قرار دیا ہے اور مرکزِ ملت کو اختیار دیا ہے کہ وہ زکوٰۃ کے نظم ونسق کو اپنے ہاتھ میں لے کر حسب حاجت و ضرورت مستحقین میں تقسیم کرے، اِس سے دو قسم کے نتائج برآمد ہوتے ہیں ایک یہ کہ ملت کے وہ افراد جو خود کمانے سے معذور ہیں باعزت طریق سے زندگی بسر کر سکتے ہیں اور وہ دوسروں پر بوجھ نہیں بنتے، اس کے نتیجہ کے طور پر معاشرہ میں امکانی حد تک معاشی مساوات رونما ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ زکوٰۃ دینے والے لوگوں میں جذبۂ منفعتِ ذات فنا ہو جاتا ہے اور اس سے ان کے نفوس کا تزکیہ ہوتا ہے۔

خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها وصلِّ عليهم ان صلوتك سكن لهم (التوبہ)

آپ ان کے اموال سے صدقہ لیں جو ان کو پاک کرے گا اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرے گا۔ اور ان کے حق میں دعا کریں آپ کی دعا ان کے لئے باعث طمانیتِ خاطر ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم تؤخذ من اغنياءهم وترد الى فقرائهم (صحاح)

زکوٰۃ مالداروں سے لی جاتی ہے، اور اہلِ احتیاج میں تقسیم کی جاتی ہے۔

بالکل یہی حال فریضۂ حج کا ہے کعبۃ اللہ مسلمانانِ عالم کا روحانی اور ملی مرکز ہے اور سال میں ایک مرتبہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے سربرآوردہ افراد کا اجتماع ہمہ گیر جذبۂ اخوت اسلامی کی تجدید کرتا ہے اور اس سے بیشمار شخصی، اجتماعی اور ملی نتائج وثمرات پیدا ہوتے ہیں خدائے قدوس نے "قیاماً للناس" کے الفاظ میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ حج کے بارے میں بھی قرآن حکیم نے "تقویٰ" کی اصطلاح استعمال کی ہے جس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔

لن ينال الله لحومها ولا دماؤها ولكن يناله التقوى منكم (سورۂ حج)

اللہ کے پاس قربانیوں کے گوشت اور خون نہیں پہنچتے۔ بلکہ تمہارا تقویٰ ہی پہنچتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اسلامی عبادات سے مقصود بالذات اگرچہ تعلق باللہ کو تقویت دینا ہے لیکن یہ تعلق ایسا نہیں ہے کہ زندگی کے دوسرے شعبے (جو دوسری قوموں میں دین کی گرفت سے آزاد ہوتے ہیں)

اس تعلق سے یہ نیا نہ ہوں بلکہ یہاں پوری زندگی اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔

مصلحت کلیہ کی رعایت معاشرہ کی سیاست و معیشت میں سطحی انقلاب لانا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ محض مادی قوت، فوجی حملہ و ہجوم، جبر و تشدد، وحشت و بہیمیت، سیاسی جوڑ توڑ، پارٹی پالیٹکس کے بے مغز دعاوی اور بعض دفعہ بے مقصد ہنگامہ آرائیوں اور بے حقیقت نعروں سے بھی ایسا انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے لیکن تعمیری انقلاب جو اسوۂ نبوت کے ذریعہ معرض وجود میں آتا ہے۔ انتہائی مشکل اور سخت وقت طلب ہے۔ اس میں سب سے پہلے انسانوں میں انقلابی فکر اور اسلامی ذہن پیدا کرنا پڑتا ہے اور پھر بہ تدریج پوری زندگی کو بالکل ایک نئے سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے۔ اس راہ میں جو عملی مشکلات پیش آتی ہیں ان کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جو حقیقی انقلاب اور سطحی انقلاب کے فرق کو سمجھنے کی اپنے اندر صلاحیت رکھتا ہے اور جو اس میدان کارزار کا مرد شمشیر زن ہے اور جن لوگوں کے یہاں خواہشِ تن پروری کی تسکین ہی زندگی کا حقیقی مسئلہ ہے اور ان کا پورا فلسفۂ زندگی انہی بنیادوں پر اٹھایا گیا ہے وہ انبیاء علیہم السلام کی انقلابی مہم کی حقیقت کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔

منصور بر سر دار ایں نکتہ خوش سراید ۔۔۔ از فلسفی پرسید امثالِ ایں مسائل!

اس راہ کی ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ جو عقائد و خیالات لوگوں میں نسلاً بعد نسل چلے آتے ہیں ان کی عقیدت و محبت کچھ اس طرح قلوب و اذہان پر مسلط ہوتی ہے کہ وہ ان کے خلاف معمولی سے معمولی بات بھی سننا پسند نہیں کرتے، اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت قلوب و اذہان کے تزکیہ و تطہیر ہی سے کام کی ابتدا کرتی ہے۔ اور پھر دوسرے مرحلہ پر نئے عقائد و خیالات اور علوم و افکار سے اس خلا کو پُر کیا جاتا ہے جس کو تعمیر فکر کہتے ہیں۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین کا مقصد محض جزوی انقلاب برپا کرنا نہیں ہوتا بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں مکمل تبدیلی پیدا کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسی تبدیلی جس میں زندگی کا نقطۂ نظر ہی بدل جائے اور انسان کا ظاہر و باطن سراسر منقلب ہو جائے اتنا محنت طلب اور کٹھن ہے کہ عصر حاضر کا انسان اس کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔ اور توفیق الٰہی کے سوا اس کام کی تکمیل دشوار ہی نہیں، بلکہ ناممکن ہے۔

ان عملی مشکلات کے علاوہ انسانی نفسیات کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ جو لوگ جماعت کے بنیادی اصول و مقاصد کے اقرار و تسلیم کے بعد جماعت میں داخل ہوتے ہیں ان کی ذہنی، فکری اور عملی صلاحیتیں یکساں نہیں ہوتیں، کوئی فطرتِ صالحہ رکھتا ہے جو پہلے سے قبولِ حق کے لئے آمادہ ہوتی ہے اور کوئی محض دیکھا دیکھی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے اور اس کے ذہن میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوتی ایک اعلیٰ درجہ کا ذہین ہے جو جدید فکر کو قبول کرنے کے بعد فوراً اس کے تمام تقاضوں کو سمجھ لیتا ہے اور دوسرا اتنی سوجھ بوجھ نہیں رکھتا کہ اس انقلابی فکر کو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی کر سکے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ جماعت میں آنے کے بعد دین کے نفاذ اور نظمِ جماعت کی شدید پابندیوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری صلاحیت نہ رکھتے ہوں اور ان کی اصلاح و تربیت پر کافی وقت صرف کرنے کی ضرورت ہو مگر ان کی کامل تربیت سے پہلے دعوتی مہم کی راہ میں ان کو اپنے ساتھ چلانا اعلیٰ درجہ کی انتظامی بصیرت، غیر معمولی ذہانت اور ملت کی اجتماعی مصلحتوں کے فہم و ادراک کا متقاضی ہے۔

ان حقائق کے پیشِ نظر انقلابی مہم کی کامیابی صرف اسی شکل میں ممکن ہے کہ پہلے جماعت کی ذہنی اور عملی صلاحیتوں کا جائزہ لیا جائے اور حقیقت شناس نگاہ سے اس بات کا تعین مناسب کیا جائے کہ علم و عمل، ماحول اور حالاتِ زمانہ کے پیشِ نظر جماعت کا موقف کیا ہے؟ اور ان مخصوص حالات میں اس سے کتنا کام لیا جا سکتا ہے؟ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا یہی وہ مشکل ترین مقام ہے جس میں دوسرے لوگ بالعموم غلط راہ اختیار کر جاتے ہیں اور جس سے ان کا تمام کیا کرایا اکارت چلا جاتا ہے۔

نیز اس دعوت کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں فوری نتائج (العاجلہ) کے مقابلہ میں دور رس نتائج یا ملت کی مصلحتِ کلیہ (العاقبہ) کو بہر حال ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ ایک قانونِ کلی ہے اور اسوۂ نبوت کی روشنی میں اس سے سیکڑوں جزئیات اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ انکارِ منکر (برائی کے خلاف اظہارِ نفرت) مسلمانوں کا مذہبی اور ملی فریضہ ہے اور اس کی ضرورت و اہمیت کا اندازہ ان بے شمار آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی سے ہو سکتا ہے جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں لیکن بایں ہمہ دعوتِ اقامتِ دین کی راہ میں ایسے حالات بھی

پیش آسکتے ہیں کہ یہ فریضہ نہ صرف یہ کہ ساقط ہو جاتا ہے بلکہ اس کا ترک ضروری ہو جاتا ہے چنانچہ علماء محققین نے اس اصول کو جو قرآنی آیات اور اسوۂ نبوت سے ماخوذ ہے باقاعدہ قانونی شکل دے دی ہے۔ علامہ ابن قیمؒ اپنی مشہور و معروف کتاب "اعلام الموقعین" میں لکھتے ہیں:-

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم شرع لامتہ ایجاب انکار المنکر لیحصل بانکارہ من المعروف ما یحبہ اللہ ورسولہ فاذا کان انکار المنکر یستلزم ما ھو انکر منہ وابغض الی اللہ ورسولہ فانہ لا یسوغ انکارہ وان کان اللہ یبغضہ ویمقت اھلہ وھذا کالانکار علی الملوک والولاۃ بالخروج علیھم فانہ اساس کل شر وفتنۃ الی آخر الدھر وقد استأذن الصحابۃ رسول اللہ صلعم فی قتال الامراء الذین یؤخرون الصلوٰۃ عن وقتھا وقالوا افلا نقاتلھم فقال لا ما اقاموا الصلوٰۃ وقال من رأی من امیرہ ما یکرھہ فلیصبر ولا ینزعن یدا من طاعتہ ومن تامل ما جری علی الاسلام فی الفتن الکبار والصغار رآھا من اضاعۃ ھذا الاصل وعدم الصبر علی منکر فطلب ازالتہ فتولد منہ ما ھو اکبر منہ:

(اعلام الموقعین)

آنحضرت صلعم نے برائی کے خلاف اظہار نفرت کرنا امت کیلئے ضروری قرار دیا ہے تاکہ برائی کے مٹنے سے معروف حاصل ہو لیکن اگر انکار منکر سے اگر کوئی اس سے بھی بڑی برائی پیدا ہوتی ہو تو اس کا انکار ہرگز مناسب نہیں ہے اگرچہ اس منکر کو اللہ تعالیٰ برا سمجھتا ہے اور منکر کا ارتکاب کرنیوالوں کو سزا دیتا ہے۔ اسکی مثال جیسے کہ امراء و ملوک کے خلاف خروج کرنا ہے جو ہمیشہ فتنہ و شر کی اساس ہے صحابہؓ نے رسول اللہ صلعم سے اُن امرا کیخلاف جنگ کرنیکی اجازت طلب کی جو نماز کو وقت سے موخر کر دیتے ہیں اور کہا کہ کیا ہم ان سے قتال نہ کریں؟ آپنے جواب دیا۔ ہرگز نہیں جب تک وہ نماز قائم کرتے رہیں۔ اور فرمایا جو شخص اپنے امیر سے کوئی ایسی بات دیکھے جسکو وہ ناپسند کرتا ہے تو اسے صبر کرنا چاہیئے اور اطاعت سے ہاتھ نہیں کھینچنا چاہیئے۔

اسلام پر جتنے چھوٹے بڑے فتنے نازل ہوئے ہیں ان پر اگر دقت نظر سے غور کیا جائے تو یہ بات خودبخود ہی نظر آجائیگی کہ یہ سب کچھ اس اصل کے ضائع کرنے اور اسکی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے ہوا۔ یعنی منکر پر صبر کرنے کی بجائے اسکے ازالہ کی کوشش کی گئی اور نتیجہ کے طور پر اس سے بڑی برائی پیدا ہوتی چلی گئی:

رسائل و مسائل :

کیا اسلامی نظام کا قیام فرض نہیں ؟

سوال :-

موجودہ تحریک جو جماعت اسلامی نے شروع کر رکھی ہے مجھے اس کے متعلق چند شبہات ہیں، جن کا ازالہ کرانا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

قرآن میں کئی ایک مقامات پر دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کبھی یہ کہا گیا کہ ہم نے ابراہیم، موسےٰ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کو دین کے قائم کرنے کا حکم دیا تھا۔ (وصّیٰ بہ ابراھیم و موسیٰ ...... ان اقیموا الدین) کبھی نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اس دین کو تمام اہل ادیان پر غالب کر دیں (لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ) اس کے علاوہ عام مسلمان جماعت کو مخاطب کر کے فرمایا گیا، کنتم خیر امۃٍ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ تم میں ایک فریق ایسا ہونا چاہیئے جو نیکی کی ہدایت اور بدی سے منع کرنے کے کام میں لگا رہے۔ چنانچہ مولانا مودودی "حقیقت اسلام" کے خطبے میں دین کی تشریح کرتے ہوئے خداوند کریم ہی کو اللہ سمجھنے اور اس کے علاوہ کسی کو حاکم، مالک اور صاحب اقتدار تسلیم نہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ اور یہ حق ہے۔

لیکن موجودہ دور میں جماعت اسلامی اس چیز کی کوشش کر رہی ہے کہ ایک خاص زمین میں اسلامی نظام رائج ہو۔ مطلب یہ کہ وہ براہ راست (ڈائرکٹلی) اسلامی اسٹیٹ کے حصول کے لئے کوشاں ہے، اور اسی کو وہ دین سمجھے ہوئے ہے۔ یہ چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سے ہم کو نہیں ملتی۔ انہوں نے کبھی اس قسم کی کوشش نہ فرمائی تھی۔ ان کی دعوت صرف اتنی ہی تھی کہ لوگو! یہ جو تم نے خدا کو چھوڑ کر

دوسرے موجودات کو الٰہ، یعنی حاکم اعلیٰ، قانون ساز، رازق، مالک اور آقا سمجھ رکھا ہے یہ ایک باطل مسلک ہے۔ تمام بتوں کو چھوڑ کر صرف ایک خدا کے ہو کے رہو! اس دعوت کے ماننے والے ترقی کرتے گئے اور آخرکار خدا تعالیٰ نے اپنے انعام کے طور پر وہ خطۂ زمین جس میں اسلامی نظام قائم ہوا انہیں بخش دیا۔ اس کے لئے کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ جیسا کہ ارشاد ہے کہ وانتم الاعلون ان کنتم مومنین نیز وعد اللہ الذین امنوا وعملوا الصلحت منکم لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم۔ میرے اس طرز استدلال سے آپ کو کیا اختلاف ہے؟

علاوہ بریں اچھا ہو کہ یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ ان الدین عند اللہ الاسلام میں "دین" اور "اسلام" کے الفاظ کا مفہوم کیا ہے اور دونوں میں فرق کیا ہے۔

جواب:-

آپ کے پہلے سوال کے جواب میں حسب ذیل امور پیش کئے جاتے ہیں:-

(۱) اسلامی حکومت وسلطنت کا ایک قابلِ سعی وجہد مقصود ہونا اور اس کا انعام الٰہی کی حیثیت رکھنا، یہ دونوں باتیں باہم نقیض نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ہر انعام اس قابل ہے کہ اسکو مقصود بنا کر اس کے لئے جدوجہد کی جائے۔ ایک صالح عقیدہ پر اور ان کا کاربند ہونا، معصیت سے نجات پانا، دین حق پر مستقیم ہونا، صدیق و شہید اور صالح ہونا یہ سبھی کچھ اللہ کی عطا و بخشش اور اسکی عنایات خاص ہی پر منحصر ہے لیکن ان میں سے ہر نعمت ایک خاص طرح کی جدوجہد کی شرائط پوری کرنے ہی سے حاصل ہوتی ہے، بغیر جدوجہد اور بغیر شرائط ادا کئے کوئی ادنےٰ سے ادنیٰ نعمت بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اللہ کے انعامات کی منڈی میں روک کسی کے لئے بھی نہیں، لیکن کسی نااہل کو بھُس کا ایک تنکا بھی یہاں جدوجہد کی قیمت ادا کئے بغیر نہیں ملتا، کجا کہ استخلاف فی الارض کا مقام اعلیٰ اور نظام اسلامی جیسی نعمت عظمیٰ بلا طلب ہاتھ لگ جائے:

تخت جم بکسے نہ سرائے نفروشند

(۲) دین کو قائم کرو کا جو مطالبہ انبیاء سے اور ان کی معرفت پیروان انبیاء سے کیا گیا ہے، اس کے معنی و

مفہوم پر کچھ تو غور آپ کرتے ! کیا "دین کو قائم کرو" کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پورے کا پورا دین (یکون الدین کلہ للّٰہ) قائم کرو، نہ کہ آدھا، تہائی اور چوتھائی ؟ اگر پورے دین کی اقامت کا مطلب ہے تو پھر صرف اللہ کے حاکم، مالک، خالق اور قانون ساز ہونے کا اقرار کر دینے اور اعلان کر دینے پر یہ معاملہ ختم کیسے ہو گیا ؟ دین کی اقامت صرف شخصی زندگی ہی میں مطلوب نہیں ہے، بلکہ ایک شخص جتنے اجتماعی معاملات و ادارات سے وابستہ ہوتا ہے، ان سب میں اقامتِ دین کی جدوجہد کرنا اس کا فرض ہے۔ دین کے بعض مطالبات فرد سے ہیں، بعض جماعت سے، بعض حکومت اور اسٹیٹ سے اور جب تک یہ سارے مطالبات پورے نہ ہونے لگیں، پورا دین قائم کب ہوا۔

(۳) لیظہرہ علی الدین کلہ میں اگر دین کو ہر دوسرے دین اور ہر دوسرے نظام اور ادارے پر غالب کر دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے تو اس کے معنی بھی اپنی جگہ صاف ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ایک مسلمان جو اس حکم کا مخاطب ہے، اس کا فرض اتنا ہی تو نہیں ہے کہ اس کی ذات پر دین کے چند احکام جاری ہونے لگیں، بلکہ اس کے فرائض ہی میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ دین کے اوامر و نواہی کو منڈیوں میں، کارخانوں میں، عدالتوں میں، دفتروں میں، اسمبلیوں میں، تھانوں میں، چھاؤنیوں میں ہر جگہ غالب کرنے کی جدوجہد کرے۔ ورنہ دین کے غالب ہونے کا مفہوم اس صورت میں باقی رہ کہاں جاتا ہے کہ افراد خدا کا حاکم ہونا مانتے رہیں لیکن اسمبلی میں اس کے احکام کو کوئی پوچھنے والا تک نہ ہو، عدالت میں اس کے قانون پر توجہ کرنے کی ضرورت نہ پڑے، چھاؤنیوں میں اس کے مطالبات کا پاس نہ کیا جائے، تھانوں میں اس کے دین کے تقاضوں کی طرف کوئی دھیان نہ دیا جائے، کھیتوں، کارخانوں اور منڈیوں میں خدا کی ہدایت کی پیروی کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو۔ بلکہ سارے عملی شعبہ ہائے حیات میں اسلام کے مقابل کے باطل ادیان اور باطل ضابطوں پر سارے کاروبار چلتے رہیں۔ اگر کسی فرد کا ان سے کلیتہً بے تعلق رہنا ممکن ہوتا تب تو انفرادی طور پر اقامتِ دین کے کچھ معنی ہو سکتے تھے، لیکن جب حکومت اور سوسائٹی کے نظام میں ہر فرد حصہ دار ہوتا ہے اور اسی وجہ سے وہ اس کے ہر صواب و ناصواب میں بھی شریک و سہیم ہوتا ہے تو اپنی جگہ سوچیے کہ وہ خود اپنی ذات پر بھی دین کو غالب کب

کر سکا!

(۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت تو خود یہ بتاتی ہے کہ غیر اسلامی نظام اور ماحول کے اندر دین کے تقاضوں کو پورا کرنا غیر ممکن ہے اور ایک مسلم کو یا تو ماحول سے لڑنا پڑتا ہے یا اس سے علیحدہ ہونا پڑتا ہے۔ دونوں کے درمیان صلح و سازگاری کی کوئی راہ نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے بہت قبل یہ محسوس کر لیا تھا کہ مکہ میں تحریک پنپ نہ سکے گی، چنانچہ آپ نے مکہ میں آنے والے مسافروں، اور بالخصوص حاجیوں سے مل مل کر ان کو دعوت دینے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، یہاں تک کہ مدینے کے انصار نے تعاون کی حامی بھری اور آپ نے ان کے وفود سے کامل نباہ کا عہد لیا اور انہیں نباہ کا یقین دلایا۔ پھر آپ مدینہ پہنچے۔ پھر وہاں جاتے ہی قوت کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ پھر مدینہ میں اقتدار کی باگ ڈور ہاتھ میں لی، پھر گرد و پیش کے قبائل سے معاہدے کئے، پھر قریش کی قوت سے ٹکر لینے کی تیاریاں کیں، یہاں تک کہ اسلامی اسٹیٹ قائم (ESTABLISH) ہو گیا اور اس تدریجی کوشش کی ساری کڑیاں وحی الٰہی کے امر و نہی کے سانچے میں ڈھلی تھیں۔ ان واقعات کو آپ ایک اسکیم (PLAN) کے تحت یکے بعد دیگرے نمودار ہوتا ہوا پاتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے سامنے ایک صالح ریاست، صالح نظام، صالح معاشرے اور صالح قیادت کو مدینہ سے آغاز کر کے ساری دنیا میں پھیلا دینے کا باقاعدہ پروگرام تھا، اور اس پروگرام کے لئے جو جدوجہد ضروری تھی، وہ سرانجام دی گئی:

وہاں اس کام کے لئے وطن کی آسائشیں، جان و مال کی قربانیاں، دوستیوں اور رشتہ داریوں سے قطع تعلق کی بے پناہ قربانیاں صرف کی گئیں اور آپ فرماتے ہیں کہ جدوجہد نہیں کی گئی بلکہ آرام سے بیٹھ کر نظام الٰہی کا انتظار کیا گیا۔

(۴) انتم الاعلون ان کنتم مومنین میں جو چیز بیان کی گئی ہے وہ تو مسلمانوں کو بہت آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے، لیکن آج ان کو معنی اگر سمجھ میں نہیں آتے تو "ان کنتم مومنین"

سکے نہیں آسکتے یہی حال وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصٰلحٰت الخ کے مفہوم کو سمجھنے کا ہے۔ یہاں بھی استخلاف فی الارض کا مطلب معلوم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی لیکن الذین آمنوا وعملوا الصٰلحٰت منکم کے الفاظ بھی ایسے ہو کے رہ گئے ہیں جن کے معنی کسی تفسیر اور کسی لغت سے حل نہیں ہوتے، جیسے بنی اسرائیل "ان البقر تشابہ علینا" کی حالت میں مبتلا ہو گئے تھے۔

ایمان لانے کے معنی کسی عقیدے کو صرف زبان سے بیان کر دینے تک محدود نہیں ہیں، بلکہ کسی اصول اور عقیدے کی حقانیت پر یقین کرتے ہوئے عملی زندگی کے لئے اپنانے کا نام ایمان ہے اور عمل صالح خیالی نیکیوں کا نام نہیں، بلکہ دماغ، ہاتھ پاؤں اور دوسری قوتوں سے اللہ کی اطاعت میں کام کرنے کا نام ہے۔ اسی عمل صالح میں ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ شامل ہے، اسی میں واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً شامل ہے، اسی میں وتواصوا بالحق، وتواصوا بالصبر شامل ہے، اسی میں ان احکم بینہم بما انزل اللہ شامل ہے، اور اسی میں وعلیکم بالجماعۃ شامل ہے اور دوسرے بے شمار مطالبات ہیں۔ انہی سارے مطالبات کو پورا کرنے سے عمل صالح کی شرط پوری ہوتی ہے اور پھر وہ جزا ملتی ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

(۵) قرآن میں یہی حکم مثبت نہیں آیا کہ اللہ کی اطاعت کرو، بلکہ یہ نہی بھی آئی ہے کہ اجتنبوا الطاغوت اور پھر یہ کہ لا تطیعوا امر المسرفین، پھر یہ کہ لا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا واتبع ھواہ وکان امرہ فرطاً۔

سوال یہ ہے کہ اگر کوئی نظامِ حکومت طاغوت کی حیثیت اختیار کر جائے، کوئی عدالت اور اسمبلی "مسرف" ہو اور کوئی قیادت و وزارت ذکر الٰہی سے غافل اور خواہشات نفس کی پیرو اور افراط و تفریط کی حالت میں مبتلا ہو تو کیا اسکی اطاعت کرنے کی حالت پر قانع رہنا درست ہوگا اور اس حالت میں ایمان و عمل صالح کی شرط پوری ہو سکیگی؟

ظاہر ہے کہ جو اسٹیٹ، جو معاشرہ اور جو قانونی نظام خدا کی حدود سے آزاد ہو اسکو ان حدود کا پابند بنائے بغیر ایک مسلمان کی زندگی گذارنا محالات میں سے ہے۔ اس وجہ سے اسٹیٹ اور معاشرے کو اسلامی اسٹیٹ اور اسلامی معاشرے میں بدلنے کی جدوجہد کرنا خود اپنے مسلمان ہونے کے لئے بھی ضروری ہے۔

(۶) دنیا میں اور بھی نظام ہائے زندگی ہیں اور ان کے علمبردار کام کرتے ہیں، لیکن اور کسی کے سامنے یہ سوال کبھی نہیں آتا کہ میں صرف عقیدہ کافی ہے اور نظام زندگی کو اپنے اصول پر ڈھالنے کی ضرورت نہیں، بلکہ سرمایہ داری، جمہوریت کے سپاہی بھی اور کمیونزم کے سپاہی بھی جانوں کی بازیاں لگا لگا کر اپنے اصول کی بنیادوں پر جا بجا اپنے پسندیدہ نظاموں کے قیام کی جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں، لیکن نہ معلوم ایک مسلمان ہی اس سوچ میں کیوں پڑا ہوا ہے کہ اس کے لئے خدا کا قانون عملاً جاری کرنے کی جدوجہد ضروری بھی ہے یا نہیں اور کیا صرف اس پر عقیدہ رکھنا کافی ہے یا نہیں؟

رہا آپ کا دوسرا سوال، سو اس آیت میں جو بات اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے منظور شدہ (SANCTIONED) دین (ضابطۂ حیات یا نظام زندگی) صرف اسلام ہی ہے، اور کوئی نہیں۔ یعنی وہ طریقۂ حیات جس پر انسان کو زندگی گذارنا چاہیئے اور جس پر چلنے کی ہدایت جس سے انحراف کی سزا اللہ تعالیٰ کے ہاں سے ملے گی وہ صرف اسلام کا طریقۂ حیات ہے، کسی اور دین پر چلنے کی ہدایت یا منظوری اللہ نے نہیں دی، بلکہ لوگوں نے دوسرے مختلف طریقے خود گھڑ لیئے ہیں۔ اسکی توضیح اس کلمہ سے ہوتی ہے کہ ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ۔ یعنی جس کسی نے الاسلام کے سوا اپنے لئے کوئی اور ضابطۂ حیات یا نظامِ زندگی اختیار کیا تو اللہ کے ہاں غیر اسلام پر چلنا اسکی طرف سے قبول نہ کیا جائیگا، بلکہ اسکی سرگرمیوں کو اس کے منہ پر دے مارا جائیگا کہ ان کی ضرورت نہ تھی۔ تم نے اطاعت تسلیم کی نہیں، بغاوت و سرکشی کی زندگی گذاری ہے۔

غالباً ان الفاظ سے آیت کا منشا آپ کے سامنے آسکیگا۔

تفصیل کے لئے جماعت کے بنیادی لٹریچر میں سے "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" "اسلام کا نظریہ سیاسی"، "رسالہ تجدید و احیائے دین" "تفہیم القرآن" کے فٹ نوٹس، یہ ترجہاد فی سبیل اللہ" اور "الجہاد فی الاسلام" میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بحث کو ملاحظہ فرمالیجیے!

سلسلۂ مباحث

اسلامی ریاست

مبحث :- **کارکنوں کی ذمہ داریاں** قیمت ۱۴ آنے

اور

اُن کے اوصاف

مبحث :- **شہریت کے حقوق و فرائض** قیمت ایک روپیہ

مبحث :- **اطاعت کے شرائط اور حدود** قیمت ۱۰ آنے

مولانا امین احسن اصلاحی

سرورق مطبوعہ رپن پریس ، لاہور